

حصہ سوم



اسیریاں



میری اسیریاں (قید و بند)

جدوجہد آزادی میں مصروف افراد کے لئے جیل،
حوالات اور تفتیشی مراکز کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتے۔
بالفاظ دیگر جدوجہد آزادی اور اسیری عام طور پر لازم و ملزوم
ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی وقفے وقفے سے جیل یا تڑا کرتا
رہا اور ان اسیریوں کے دوران دلچسپ اور سبق آموز
واقعات پیش آتے رہے۔

اپنی اسیریوں سے متعلق تفصیلات بیان کرنے کا
اہم مقصد یہ ہے کہ قارئین خاص کر حال اور مستقبل کا
نوجوان طبقہ ان اسیریوں سے متعلق واقعات سے مناسب
سبق اور معلومات حاصل کرے۔ علاوہ ازیں چونکہ ان
اسیریوں کے دوران کے واقعات میری زندگی کے اہم اور
یادگار واقعات میں سے ہیں اس لئے اپنی داستان حیات میں
ان کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔



پہلی اسیری

1947-48ء میں کشمیر کی جنگ آزادی کے دوران میں مقبوضہ کشمیر کے ہندواڑہ ہائی سکول میں زیر تعلیم تھا۔ ہمارے کچھ مسلمان اساتذہ جنگ آزادی میں عملی حصہ لینے والوں سے قریبی تعلق رکھے ہوئے تھے اور وہ کچھ طلباء سے بھی جن میں میں بھی شامل تھا، چھوٹے موٹے کام لیتے۔ ایک دن ہمارے یہ اساتذہ گرفتار ہو گئے۔ میں اتوار منانے کے لئے ہمیشہ کے ہاں ہانی ہامہ گیا ہوا تھا وہاں سے پیر کو سکول آیا تو سکول سے ہی مجھے پولیس پکڑ کر تھانے لے گئی۔ رات کو مجھ سے پوچھا گیا کہ آیا میں بھی سکول کے اساتذہ کے خفیہ اجلاسوں میں شرکت کرتا تھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا جو کہ حقیقت تھی۔ بہر حال زیادہ پوچھ گچھ نہیں ہوئی نہ ہی کوئی تشدد ہوا۔ غالباً تھانے کا انچارج بھی آزادی کشمیر سے دلچسپی رکھتا تھا چنانچہ اس نے مجھے کیس سے بچا لیا۔ اور دوسری صبح کو مجھے چھوڑ دیا گیا۔ یہ تھی میری پہلی اور مختصر ترین اسیری۔

کراچی مئی 1965ء

دوسری بار میری گرفتاری مئی 1965ء میں کراچی میں ہوئی۔ 9 مئی 1965ء کو شیخ محمد عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کو سعودی عرب سے واپسی پر دہلی ایئرپورٹ پر گرفتار کیا گیا۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو اس گرفتاری کے خلاف کراچی میں احتجاجی جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا۔ لیکن اس پروگرام پر عمل ہونے سے پہلے ہی ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں میرے علاوہ میر عبد القیوم، غلام حسن پنجابی، غلام محی الدین بانکا، ملک عبدالرشید، غلام رسول شاہ، محمد ممتاز عباسی اور عبدالغفار لون شامل تھے۔ رات کو ہمیں مختلف پولیس سٹیشنوں میں رکھ کر دوسرے دن سنٹرل جیل کراچی بھیجا گیا۔ جہاں ہم تقریباً ایک ہفتہ رہے۔ جس کے بعد ہمیں رہا کر دیا گیا۔

یہ میری دوسری اسیری تھی۔

کراچی ستمبر 1965ء

ستمبر 1965ء میں پاک بھارت جنگ ہوئی۔ پاکستانی اخبارات اور خبروں سے پتہ چلتا تھا کہ جنگ میں پاکستان کا پلہ واضح طور پر بھاری ہے۔ لیکن 20 ستمبر کو اچانک خبر آئی کہ حکومت پاکستان

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرار داد کو منظور کرتے ہوئے جنگ بندی پر راضی ہو گئی ہے جس کا پاکستانیوں کے علاوہ ہم کشمیریوں کو بھی سخت افسوس ہوا چنانچہ ہم نے جنگ بندی کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے لاؤڈ سپیکر پر مظاہرے کا اعلان کرنے کی ذمہ داری لے لی اور ملک عبدالرشید کو ساتھ لے کر ایک ٹیکسی میں لاؤڈ اسپیکر نصب کر کے شہر میں احتجاجی مظاہرے کا اعلان کیا۔ ہمارے انتہائی جوشیلے اعلان سے لوگوں کے جذبات اور بھی بھڑک اٹھے چنانچہ دوسرے دن کراچی کی تاریخ کا سب سے بڑا احتجاجی جلوس نکلا۔ شہر کے مختلف حصوں سے چھوٹے چھوٹے جلوس آکر بندر روڈ پر جمع ہوئے اور وہاں سے ایک بہت بڑے جلوس کی شکل میں امریکی سفارت خانے کی طرف چل پڑے۔ میں اب بھی ایک ٹیکسی میں بیٹھا نعرے لگا رہا تھا جس کا جواب مظاہرین کی طرف سے فلک شکاف نعروں کی صورت میں ملتا رہا۔ ہم میٹروپول ہوٹل کے پاس پہنچے تو آگے پولیس نے راستہ روکا ہوا تھا۔ جلوس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اس پر آنسو گیس پھینکی گئی۔ چنانچہ مظاہرین کو واپس جانا پڑا۔ میری ٹیکسی کے اندر بھی آنسو گیس جمع ہوئی تو میں باہر نکل کر آنکھیں بند کر کے ایک طرف بھاگا۔ اس طرح جلوس منتشر ہو گیا۔ رات کو ایک بجے مجھے لی مارکیٹ میں اپنی رہائش گاہ سے گرفتار کر کے نیپڑ تھانے میں اور دوسرے دن فیروز تھانے میں بند کیا گیا اور تیسرے یا چوتھے دن رہا کر دیا گیا۔

گلگت جیل میں سات ماہ

اکتوبر 1970ء میں آزاد کشمیر میں عام انتخابات ہونے تھے۔ میں ان دنوں محاذ رائے شماری کا چیئرمین پبلش بورڈ تھا۔ ہمارا مطالبہ تھا کہ انتخابات قانون ساز اسمبلی کی بجائے آئین ساز اسمبلی کے لئے ہوں اور اس میں گلگت، بلتستان کو بھی نمائندگی دی جائے۔ چونکہ یہ مطالبات منظور نہیں ہوئے اس لئے ہم نے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کے علاوہ ہفتہ گلگت، بلتستان منانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں محاذ کے لیڈروں عبدالخالق انصاری، مقبول احمد بٹ، میر عبدالمنان اور دوسرے عہدیداروں نے اکتوبر کے اوائل میں آزاد کشمیر اور پاکستان کے مختلف شہروں کے دورے کئے اور وہاں عام جلسوں میں عوام کو گلگت، بلتستان سے متعلق حقائق سے آگاہ کیا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اسی ماہ کا اواخر میں محاذ کے عہدیداروں کا ایک گروپ گلگت، بلتستان کا دورہ بھی کرے۔

ہم نے 28 اکتوبر کو گلگت جانے کا پروگرام بنایا لیکن اس دن موسم کی خرابی کی وجہ سے اسلام آباد سے گلگت کی ہوائی جہاز کی فلائٹ نہیں ہوئی اس لئے ہم گلگت نہیں جاسکے۔ دوسرے دن ہم (عبدالخالق انصاری، مقبول بٹ، میر عبدالمنان اور میں) جہاز میں سوار ہو کر گلگت روانہ

ہو گئے اور گلگت ایئرپورٹ سے سیدھے اندس ہوٹل پہنچے۔ خیال تھا دوسرے دن مقامی لوگوں سے ملیں گے اور ممکن ہوا تو وہاں ایک جلسہ عام بھی کریں گے۔ دن کو ہم لوگوں سے ملتے رہے لوگوں میں خوف و ہراس تھا اور وہ ہم سے ملنے سے ہچکچا رہے تھے۔ 28 اکتوبر کو مقامی انتظامیہ نے اپنے کچھ کٹھ پتلیوں کے ذریعہ ہمارے خلاف مظاہرہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور اس مقصد سے کچھ کٹھ پتلی ٹھیکیداروں کے مزدوروں کو سیاہ جھنڈیاں دے کر ایئرپورٹ پہنچایا گیا تھا تاکہ وہ ہماری آمد پر ہمارا استقبال سیاہ جھنڈیوں سے کریں لیکن اس دن موسم کی خرابی کی وجہ سے ہم گلگت نہ پہنچ سکے تھے چنانچہ ان کرائے کے مظاہرین کو واپس جانا پڑا۔ مقامی انتظامیہ کے اس اقدام کی وجہ سے کچھ باشعور مقامی افراد خاص کر کچھ نوجوانوں کے دلوں میں ہمارے لئے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ عبدالحمید، امیر حمزہ، یوسف جمال وغیرہ پر مشتمل نوجوانوں کے ایک گروپ نے پروگرام بنایا کہ اگر حکومت نے ہمارے خلاف دوسرے دن بھی مظاہرے کرانے کی کوشش کی تو وہ (نوجوان) پوری مزاحمت کریں گے۔ جب حکام کو نوجوانوں کے ان جذبات کا پتہ چل گیا تو دوسرے دن ہمارا کالی جھنڈیوں سے استقبال کرنے کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا۔

شام کو میں گلگت میں مقیم اپنے کچھ عزیزوں سے ملنے گیا۔ رات نو بجے کے قریب چند افراد وہاں آئے اور مجھے کہا کہ اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس محمد باہر خان صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں مجھے کہا گیا کہ باہر صاحب اپنے دفتر میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اس طرح مجھے پولیس سٹیشن پہنچایا گیا جہاں باہر صاحب کی بجائے میرے ساتھی بیٹھے تھے۔ میرے ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ انہیں پولیس شام کو ہی ہوٹل سے اٹھا لائی تھی اور یہ کہ ہمیں واپس راولپنڈی بھیجا جا رہا ہے اور اس کی تصدیق مقامی ایس ایچ او نے بھی کی۔ اسی دوران مجھے بتایا گیا کہ امیر حمزہ کو گرفتار کیا گیا ہے اور وہ ساتھ والے حوالات میں ہے۔ میں حوالات میں امیر حمزہ سے ملا۔ امیر حمزہ استور کا ایک انتہائی جوشیلا نوجوان اور گلگت بلتستان جمہوری محاذ کا متحرک ممبر اور گلگت بلتستان کو آزاد کشمیر کے ساتھ ملانے کا پرزور حامی تھا۔ وہ حسب عادت بڑی جوشیلی باتیں کر رہا تھا۔ ہم نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ رات بارہ بجے ہم چاروں کو ہمارے سامان سمیت بھیڑ بکریوں کی طرح ایک جیپ میں سوار کیا گیا اور ساتھ پولیس گارد بھی سوار ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد شہر کے باہر یعنی کونود اس والے راستے سے ہمیں پاکستان کی طرف روانہ کیا گیا۔ دوسرے دن راستے میں ہم نے ریڈیو پر خبر سنی کہ سردار عبدالقیوم آزاد کشمیر کے صدر منتخب ہو گئے ہیں وہ رات ہم نے راستے میں ایک فوجی کیمپ میں گزاری اور دوسرے دن دوپہر کو کوئٹہ پہنچے جہاں سے گلگت پولیس واپس ہو گئی اور ہم لکڑی سے بھرے ایک ٹرک پر سوار ہو کر سوات کی طرف روانہ ہو گئے۔ انصاری صاحب کو فرنٹ سیٹ پر بٹھایا اور ہم تینوں ٹرک پر لدی ہوئی خاردار لکڑی پر بیٹھ گئے۔ ٹرک کو لگنے والے جھکوں سے ہم اچھل کر کھاردار لکڑی پر گرتے جس سے انتہائی تکلیف

ہوتی۔ سڑک بھی ایسی تھی کہ نیچے دیکھو تو تقریباً ہزار گز کے عمودی فاصلے پر رواں دواں دریائے سندھ پر نظر پڑتے ہی سر چکرانے لگتا۔ انصاری صاحب تو پورے سفر کے دوران ڈر کے مارے قرآنی آیات پڑھتے رہے۔ بہر حال خدا خدا کر کے ہم دوسرے دن سوات پہنچے اور تیسرے دن راولپنڈی۔

ہم 27 نومبر کو پھر گلگت روانہ ہوئے۔ اب کے گروپ میں میرے علاوہ مقبول بٹ صاحب، میر عبدالمنان صاحب، غلام مصطفیٰ علوی صاحب اور جی ایم میر صاحب تھے۔ سابقہ تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے اب کے ہم لاؤڈ اسپیکر بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے اور ساتھ ہی شینا زبان کی کچھ نظمیں خاص کر فضل الرحمن کی مشہور زمانہ نظم ”سوہنی وطنِ گلگت“ (میرا سنہرا وطنِ گلگت) بونجی کے حشمت اللہ اور ریڈیو پاکستان کے شینا پروگرام والے مسٹر بہرام آف بٹین گلگت کی آوازوں میں شیپ کر کے لے گئے تھے۔

گلگت ایئرپورٹ پر اے آئی جی پولیس باہر صاحب ایک نوٹس لئے ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے ہمیں نوٹس تھما دیا۔ نوٹس میں کہا گیا تھا کہ چونکہ محاذ رائے شماری والوں کی گلگت آمد کی خبر سے یہاں کی مقامی آبادی میں ان کے خلاف غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی ہے اور محاذ والوں اور مقامی لوگوں کے مابین شدید تصادم کا خطرہ ہے اس لئے سارے گلگت بلتستان میں دفعہ 144 نافذ کی جاتی ہے۔ ہم نے باہر صاحب سے نوٹس لیا اور ان سے کہا کہ اس پر عمل کرنا نہ کرنا ہمارا کام ہے۔

ہم ایئرپورٹ سے شہر پہنچے۔ ہوٹل میں سامان رکھتے ہی ہم نے فیصلہ کیا کہ چونکہ اب جلسہ عام کرنے کا کوئی امکان نہیں اس لئے ہمیں وقت ضائع کئے بغیر کوئی جیپ لے کر اور اس میں لاؤڈ اسپیکر فٹ کر کے موبائل جلے کرنے چاہئیں یعنی تقریر کرتے ہوئے شہر کے چکر لگائے جائیں۔ چنانچہ میں جیپ کی تلاش میں نکلا لیکن کوئی مجھے جیپ دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ میرے بہت سے ذاتی دوستوں نے کہا کہ ہم کرایہ دیں گے آپ کسی اور سے جیپ لیں کیونکہ اگر ہم نے اپنی جیپ آپ کو دی تو افسر شاہی کی طرف سے ہم پر عتاب نازل ہو گا۔ مجھے کسی دوست کی طرف سے یا کرایہ پر تو جیپ نہیں ملی البتہ ہنزہ کا ایک نوجوان تیار ہوا۔ چنانچہ ہم نے اس کی جیپ پر لاؤڈ اسپیکر فٹ کیا۔ اور سوہنی وطنِ گلگت کا شیپ چلایا۔ لوگ جیپ کے گرد جمع ہونے لگے تو میں نے تقریر شروع کر دی اور لوگوں کو ان کے سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق سے آگاہ کیا۔ اس طرح تقریر کرتے اور ریکارڈ بجاتے ہوئے ہم نے قصبے کے کئی چکر لگائے۔ اس دن جمعہ تھا اور لوگ جمعہ کے لئے مضافات سے بھی آکر بازار میں جمع ہوئے تھے۔ کبھی کبھی میر منان صاحب اور بٹ صاحب بھی تقریر کرتے اور کبھی میں اردو کے علاوہ شینا زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا۔ ہم دوسری بار صدر بازار سے گزرے تو وہاں لوگوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گئی۔ میں

نے وہاں ایک انتہائی جوشیلی تقریر کی اور عوام کو ان کے آئینی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی حقوق سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ریڈیڈنٹ پولیٹیکل ایجنٹ اور دوسرے حکام عوام کے آقا نہیں بلکہ نوکر ہیں۔ میں تقریر کر رہا تھا کہ ایک عمر رسیدہ شخص جیپ کے نزدیک آیا اور میرے ہاتھ اور ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہنے لگا ”آفرین ہے اس شخص کو جس کے تم بیٹے ہو۔ ہم واقعی ان حقوق سے محروم ہیں اور یہاں کے حاکم ہمیں زر خرید غلام سمجھتے ہیں۔ یہاں آج تک کسی کو ایسی باتیں کرنے کی جرأت نہیں ہوئی جو تم کر رہے ہو“

صدر بازار میں تقریباً آدھے گھنٹے کی تقریر کے بعد ہم شہر کا ایک اور راؤنڈ لگانے لگے۔ اب کے بونچی کے ڈاکٹر رحمت اللہ جو ان دنوں طالب علم تھے بھی ہمارے ساتھ جیپ میں بیٹھ گئے۔ میری تقریر کے ساتھ وقفے وقفے سے سوہنی وطن کھیت کا ولولہ انگیز ترانہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا۔ ہم ایئرپورٹ کے نزدیک پہنچے تو پیچھے سے پولیس کی جیپوں نے آکر ہمیں گھیرے میں لے لیا اور گرفتار کر کے تھانے لے آئے۔ میرے ساتھیوں کو ایئرپورٹ لے جایا گیا تاکہ جہاز سے راؤلپنڈی بھیجا جائے لیکن اس وقت تک جہاز جا چکا تھا۔ اس لئے انہیں لا کر گلگت سکاؤٹس کے کوارٹر گارڈ میں رکھا گیا اور دوسرے دن صبح کی فلائٹ سے راؤلپنڈی بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر رحمت اللہ کو بھی رہا کر دیا گیا۔

گلگت کی جامع مسجد صدر تھانے کے ساتھ ہی ہے۔ میں تھانے میں تھا کہ نماز جمعہ سے فارغ ہو کر لوگ باہر نکلے اور اسی کے ساتھ کچھ شور سنائی دیا اور ساتھ ہی کچھ پتھر بھی تھانے کے دروازے پر آ گئے۔ باہر میرے عزیز قدم خان اور ڈاکٹر رحمت اللہ سمیت کچھ نوجوان تھانے پر حملہ کر کے مجھے رہا کرانا چاہتے تھے لیکن دوسرے لوگ متذبذب تھے اسی دوران تھانیدار نے باہر نکل کر اور خود کو ہمارا ہمدرد گردان کر لوگوں کو منتشر کر دیا۔

دوسرے دن مجھے ڈسٹرکٹ جیل لے جایا گیا۔ امیر حمزہ بھی جیل میں تھا۔ اسی دوران گلگت بلتستان کے لئے بننے والی مشاورتی کونسل کے انتخابات کے لئے دسمبر کی کوئی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ میں نے امیر حمزہ کو مشورہ دیا کہ وہ انتخاب لڑے۔ وہ شاید پہلے ہی ان خطوط پر سوچ رہا تھا چنانچہ اس نے استور کے حلقہ نمبر 1 سے اپنی امیدواری کا اعلان کیا اور حکام کو اس کی تحریری اطلاع دے دی۔ حکام بھی نہیں چاہتے تھے کہ ہم دونوں جیل میں اکٹھے رہیں چنانچہ امیر حمزہ کو رہا کیا گیا۔ اس نے استور کے راجہ خاندان کے راجہ (کاچو) محمد شاہ کے مقابلے میں انتخاب لڑا۔ میں نے اپنے تمام دوستوں اور رشتہ داروں کو خط لکھے کہ وہ امیر حمزہ کی پرزور حمایت کریں اور اسے ووٹ دیں۔ میں نے اپنے بزرگ ٹھیکہ دار مراد خان اور دوست عبدالرحمن لون کو خط لکھے کہ وہ الیکشن سے امیر حمزہ کے حق میں دستبردار ہو جائیں۔ اور دونوں امیر حمزہ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ چنانچہ امیر حمزہ جیت گیا۔ راجہ محمد شاہ صاحب استور کے شاہی خاندان سے

تعلق رکھنے کے علاوہ 1947ء تک کشمیر اسمبلی کے ممبر بھی رہے تھے۔ چنانچہ محمد شاہ کے مقابلے میں ایک انتہائی غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والے امیر حمزہ کی جیت ایک ذہنی انقلاب سے کم نہ تھی۔

ان انتخابات سے پہلے دستور کے معززین کا ایک وفد گلگت آکر پولیٹیکل ایجنٹ سے ملا اور اسے میری رہائی کے لئے کہا۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے ان سے کہا کہ وہ مجھے اسی دن رہا کرنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ میں رہا ہو کر خاموشی سے کراچی چلا جاؤں۔ وہ لوگ خوش ہو کر میرے پاس آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں کسی قسم کی مشروط رہائی کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے وہ ناامید ہو کر دستور واپس چلے گئے۔

میری گرفتاری کے کچھ مدت بعد عید آنے والی تھی چنانچہ میرے کچھ دوستوں نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی میری ضمانت کے لئے درخواست دی، ایس ڈی ایم نے پہلے تو ان سے غالباً ڈھائی لاکھ روپے کی شخص ضمانت طلب کی پھر ڈھائی لاکھ روپے کی مالیت کا مطالبہ اور اس کے بعد ڈھائی لاکھ روپے نقد طلب کئے جس پر ضمانت دینے والے اصحاب حبیب اللہ میر، عبدالسلام میر احمد میر، ٹھیکیدار فضل احمد وغیرہ نے یہ رقم بھی عدالت میں پیش کی تو ایس ڈی ایم نے کہا کہ امان اللہ کو میں صرف پابند ضمانت کر کے یعنی اس کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا کر ہی رہا کر سکتا ہوں۔ جب مجھے اس کی اطلاع ملی تو میں نے پابند ہو کر رہا ہونے سے ہی انکار کر دیا۔

5 دسمبر کو مجھے ایک سرکاری جیپ میں پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر لے جایا گیا۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے مجھے دفتر میں بٹھا کر میری خاصی خاطر تواضع کی۔ پاکستان کے سیاسی حالات اور مسئلہ کشمیر پر بڑے دوستانہ ماحول میں تبادلہ خیال کیا۔ آخر میں کہنے لگا کہ اگر آپ صرف زبانی مجھے یہ یقین دلائیں کہ رہائی کے بعد آپ یہاں کا ماحول خراب نہیں کریں گے تو میں آپ کو آج ہی رہا کرتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ اگر آپ کی اس شرط کا مطلب یہاں کے عوام کے حقوق کے حق میں آواز اٹھانے سے دستبرداری ہے تو میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اس علاقے کا (لکھا پڑھا اور سیاسی سوجھ بوجھ کا مالک) ایک فرزند ہوں۔ یہاں کے عوامی حقوق کے لئے آواز اٹھانا میرا فرض ہے اور میں اس فرض سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ کر ایک دو دن میں مجھے جواب دے دیں۔ میں نے کہا میرا جواب ہمیشہ یہی ہو گا۔ اس کے بعد اس نے مجھے رخصت کیا اور پولیس نے مجھے واپس جیل پہنچایا۔ میں نے دوسرے دن ہی اسے اپنا تذکرہ بالا جواب تحریری طور پر بھیج دیا۔

جنوری 1971ء کے اوائل میں مقامی وکلاء شیر ولی پونیا، شیرولی جنگلوٹی، الطاف حسین سعید احمد اور محمد عیسیٰ (غالباً محمد خورشید خان بھی) مجھ سے ملنے جیل آئے۔ ہم نے ملاقات کے دوران پاکستان کی سیاست، مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر اور گلگت بلتستان کی صورتحال پر

تفصیلی تبادلہ خیال کیا۔ مجھے ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ میری اور محاذ رائے شماری کے دوسرے ساتھیوں کی تقاریر اور انتظامیہ کی طرف سے ہمارے ساتھ ہونے والے برتاؤ کا مقامی آبادی پر بڑا اثر پڑا ہے اور اندر ہی اندر ایک لاوا سا پک رہا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ گلگت میں تنظیم ملت نام کی ایک تنظیم بنی ہے۔

جب لوگوں نے جیل توڑ کر ہمیں نکالا

10 جنوری 71ء کو مجھے جیل کے کچھ وارڈروں نے بتایا کہ شہر میں خاصی گڑ بڑ ہے۔ دو دن قبل پولیٹیکل ایجنٹ نے مقامی لڑکیوں کے سکول کی ہیڈ مسٹریس کے ساتھ بدسلوکی کی تھی اس لئے عوام میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی ہے شہر میں احتجاجی جلسے ہو رہے ہیں اور مقامی وکیل اس میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ شام کو خبر آئی کہ بہت سے وکیلوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اسی رات دیر سے وکیلوں (سعید احمد، الطاف حسین، محمد عیسیٰ، شیرولی پونیالی) انجینئر محمد علی اور کریم خان کو جیل لایا گیا اور سبوں کو میری کوٹھری میں رکھا گیا۔ ہم رات دیر تک حالات پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔

دوسری صبح یعنی 11 جنوری 1971ء کو ہم ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ باہر شور سنائی دیا جیل حکام کی دوڑ دھوپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی بڑی گڑ بڑ ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جیل کی عمارت پر پتھراؤ شروع ہو گیا۔ کچھ پتھر جیل کے اندر بھی گرنے لگے۔ اس کے بعد جیل کے بڑے دروازے پر کھڑے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد جیل کا بڑا دروازہ ٹوٹ گیا اور ہجوم جیل کے اندر گھس آیا۔ ہماری کوٹھری جیل کے بڑے دروازے کے ساتھ ہی تھی۔ لوگوں نے ہمیں دیکھ کر اس کا لوہے کا دروازہ توڑنے کی کوشش کی۔ اتنے میں کسی نے ساتھ کھڑے جیل وارڈر سے ہماری کوٹھری کی چابی چھین لی اور دروازہ کھول دیا۔ ہجوم دکلاء کو کھینچ کر باہر لئے آیا۔ میں نے باہر نکلنے میں ذرا تذبذب سے کام لیا تو ایک صاحب نے مجھے شینا زبان میں کہا امان صاحب اس قسم کے مسئلے قانونی نکتوں سے حل نہیں ہوتے یہ کہہ کر وہ مجھے کھینچ کر باہر لایا۔ باہر ہزاروں کا ہجوم لٹھیاں، کھاناٹیاں، ہاکیاں لئے کھڑا نعرے لگا رہا تھا ہم سب کو کاندھوں پر اٹھایا گیا اور ہجوم شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس دوران کسی نے گلگت کے کچھ نوجوانوں کو کہا کہ جیل والوں نے دروازہ ٹوٹنے سے پہلے ہی امان صاحب کو کسی اور کوٹھری میں منتقل کیا تھا۔ اس لئے وہ اندر ہی رہ گئے۔ یہ سن کر یہ نوجوان دوبارہ جیل میں داخل ہو گئے اور مناور کے عبدالحمید نے ایک وارڈر سے بددوق چھین کر اس کے سینے پر رکھی اور اس سے پوچھا بتاؤ امان صاحب کو کہا چھپا رکھا ہے۔ اس نے کہا

انہیں تو ہجوم اپنے ساتھ لے گیا عبدالحمید نے باہر نکل کر جب دیکھا کہ میں کسی کے کندھے پر سوار ہجوم کے ساتھ جا رہا ہوں تو وہ لوگ بھی دوڑ کر آئے اور ہجوم میں شامل ہو گئے۔

اب جلوس شہر کی طرف جا رہا تھا۔ ایئرپورٹ کے آخری کونے پر رک گیا اور میں نے اور شیر ولی پونیالی نے مظاہرین سے خطاب کیا۔ اس کے بعد جلوس ہمیں کاندھوں پر اٹھائے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ذرا آگے بڑھے تو دیکھا کہ سڑک پر ایک فیتہ ڈالا گیا ہے اور آگے گلگت سکاؤٹس مسلح کھڑے ہیں۔ ادھر حکام نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا کہ اگر ہجوم نے فیتے کو عبور کیا تو اس پر گولی چلائی جائے گی لیکن ہجوم نے نعرے لگاتے ہوئے اسے عبور کیا اور آگے بڑھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑک پر فیتہ پھر پھیلا دیا گیا حکام کی طرف سے آخری وارننگ دی گئی کہ اگر ہجوم سرخ فیتے سے آگے بڑھا تو اس پر یقیناً گولی چلائی جائے گی لیکن ہجوم اسے بھی پار کر گیا۔ اس پر پولیٹیکل ایجنٹ مسٹر اے آر صدیقی نے گلگت سکاؤٹس کو فائر کرنے کا آرڈر دے دیا۔ لیکن سکاؤٹس نے صرف ہوائی فائر کئے اور ہجوم آگے بڑھتا گیا۔ اتنے میں مسٹر صدیقی نے ایک سپاہی سے رائفل چھین کر ہجوم پر اندھا دھند گولیاں برسائیں۔ ایک گولی میرے سر سے صرف چند انچ دور سے گزر کر دیوار پر لگ گئی۔ اتنے میں ہجوم منتشر ہو گیا اور مسٹر صدیقی بھی دفتر کی طرف بھاگ نکلا۔

میں نے ساتھ والے کھیت پر نظر ڈالی تو اس میں کچھ لوگ گرے ہوئے نظر آئے ایک کے سینے سے خون کے فوارے نکل رہے تھے۔ میں اس کی طرف لپکا۔ یہ رجب علی تھا جس نے جیل کا دروازہ توڑا تھا اور مجھے بھی کھینچ کر کوٹھری سے باہر لے آیا تھا۔ اس کے سینے میں گولی لگی تھی۔ میں نے اس کا سر اٹھا کر اپنے گھٹنوں پر رکھا۔ اتنے میں محمد علی انجینئر بھی میرے پاس آیا۔ رجب علی نے مجھ پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور آخری ہنسی لے کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے اور محمد علی نے اپنے گلے میں پڑے ہار اتار کر رجب علی شہید کے جسد خاکی پر ڈال دیئے۔ میرے کپڑے شہید کے خون سے بھر گئے تھے۔ اس اثناء میں بہت سے لوگ بھی جمع ہو گئے اور ہم نے شہید کی لاش پر ایک چادر ڈال دی۔ کھیت میں چھ سات اور بھی زخمی پڑے ہوئے تھے جن میں سے استور کے عبدالرحمن لون کی ٹانگ گولیوں سے فرہکھ ہو گئی تھی۔ دوسرے زخمیوں میں استور ہی کے وزیر مظفر کا بیٹا محمد اقبال، بگروٹ کا ایک لڑکا اور نلسن کے ایک لڑکا اور چند دوسرے افراد بھی شامل تھے۔ ہم نے فوراً ہی جیپوں کا انتظام کر کے زخمیوں کو ہسپتال بھیج دیا اور تھانے میں پولیٹیکل ایجنٹ کی فائرنگ سے ایک شخص کی ہلاکت اور سات افراد کے زخمی ہونے کی رپورٹ درج کرانے کی کوشش کی لیکن پولیس نے رپورٹ درج کرنے سے انکار کیا۔ لوگوں نے رجب علی شہید کا پوسٹ مارٹم کرانے کی میری تجویز پہلے رد کر دی لیکن جب میں نے اس کے قانونی پہلوؤں کی وضاحت کی تو مان گئے۔ چنانچہ میں

اور شیر ولی پونیالی شہید کا جسد خاکی ہسپتال لے گئے۔ ہسپتال والوں نے پولیٹیکل ایجنٹ کی ہدایت کے تحت پوسٹ مارٹم کرنے سے انکار کیا۔ چنانچہ اسے واپس شہر لا کر ڈاکٹر اعجاز سے اس کا پوسٹ مارٹم کرایا اور تجیزو تکفین کی جس میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ تجیزو تکفین کے وقت میں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں مرحوم کے پسماندگان کی کچھ مالی مدد کرنی چاہئے جس کے لئے کچھ افراد کی ذمہ داری لگائی گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ رجب علی مرحوم ایک ہوٹل والے کا خاصا مقروض ہے۔ وہ ہوٹل والا وہاں موجود نہیں تھا کہ اس سے یہ قرضہ بخشواتے۔ چنانچہ اس قرضے کی ادائیگی میں نے اپنے ذمے لے لی اور اسی دن کراچی خط لکھا کہ وہ رقم ہوٹل والے کو بھیجی جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بعد میں گلگت میں یہ باتیں سننے میں آئیں کہ رجب علی شہید کے پسماندگان کی مالی مدد کے لئے خاصی رقم جمع ہوئی تھی لیکن انہیں پوری رقم نہیں دی گئی۔ واللہ اعلم۔

ہم اگلے دو دن قومی دواخانہ راجہ بازار کے مالک غلام مصطفیٰ کے گھر میں رہے۔ تیسرے دن افواہ پھیل گئی کہ شہر کو فوج کے حوالے کیا گیا ہے جو لوگوں کے گھروں میں گھس گھس کر ہمیں تلاش کرے گی۔ چونکہ اس قسم کی صورت حال کے نتیجے میں خون خرابے کا احتمال ہوتا ہے اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں غلام مصطفیٰ کا گھر چھوڑ کر کہیں اور جانا چاہئے۔ چنانچہ ہم سب (جیل سے نکالے جانے والے اور جوہر علی ایڈووکیٹ جن کے بارے میں افواہ تھی کہ ان کے بھی ورائٹ گرفتاری جاری ہوئے ہیں) گھر سے نکل کر اوپر برمس کی طرف چل دیئے ہمارے ساتھ مقامی نوجوان دیدار علی، محمد نکلین، لطیف حسن، عبدالحمید وغیرہ بھی تھے۔ راستے میں جوہر علی نے تجویز پیش کی کہ ہمیں ساتھ والی پہاڑی کے غار میں رات گزارنی چاہئے میں نے تجویز سے اختلاف کیا۔ چنانچہ یہ اختلاف کچھ تلخی پیدا کرنے لگا اور ہم دو گروپوں میں تقسیم ہو گئے اس سے پہلے غلام مصطفیٰ کے گھر پر بھی ہم دونوں کے درمیان کئی باتوں پر اختلاف ہوا تھا۔ بہر حال آخر میں جوہر علی، محمد علی انجینئر اور محمد عیسیٰ غار کی طرف چلے گئے اور میں الطاف حسین سعید احمد اور شیر ولی پونیالی برمس گاؤں کی طرف۔ نوجوان بھی کچھ ادھر اور کچھ ادھر ہو گئے۔ رات بارہ بجے ہم برمس کے ماسٹر عادل خان صاحب کے گھر پہنچے۔ انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ہم رات کو وہاں رہے۔ ہم دوسرے دن بھی وہاں ہی رہے اور انہوں نے دن کو ہمیں جو دہی کھانا کھلایا اس جیسا لذیذ کھانا میں نے زندگی بھر نہیں کھایا۔ شاید اس لذت میں زیادہ حصہ ماسٹر صاحب کے خلوص اور جذبہ ایثار و قربانی کا تھا کیونکہ انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں رکھ کر اپنے آپ اور خاص کر اپنی سرکاری ملازمت کو داؤ پر لگایا تھا۔ ہم دن کو برمس کی اونچائی سے شہر میں فوجی گاڑیوں کی نقل و حرکت دیکھتے رہے شام چھ بجے کے قریب ہم نے لاؤڈ اسپیکر پر ایک اعلان ہوتے سنا۔ یہ اعلان ایک جیپ سے کیا جا رہا تھا۔ جیپ ذرا نزدیک سے گزری تو ہم نے اعلان

سن لیا۔ بار بار یہ اعلان ہو رہا تھا کہ جو لوگ امان اللہ اور جیل سے مفروز ہونے والے دوسرے لوگوں (سبوں کے نام لئے جا رہے تھے) کو پناہ دیں یا ان کی جائے پناہ معلوم ہونے کے باوجود حکام کو اس کی اطلاع نہ دیں۔ انہیں دس سال کی قید بامشقت کی سزا دی جائے گی۔ اس اعلان کی عبارت سے ایک لطیفہ بھی ہوا جس سے ہم وقتی طور پر خاصے محفوظ ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے نئی صورتحال پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ ہمیں واپس غلام مصطفیٰ کے گھر جانا چاہئے تاکہ سب بیٹھ کر کوئی متفقہ فیصلہ کریں۔ چنانچہ ہم رات کو واپس غلام مصطفیٰ صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ جوہر علی وغیرہ پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ وہاں افواہ گرم تھی کہ شہر میں مارشل لاء لگایا گیا ہے اور فوج ہماری تلاش میں لوگوں کے گھروں میں گھسنے والی ہے۔ میرا ذہن 1954ء میں پلندری آزاد کشمیر میں وقوع پذیر ہونے والی ایسی ہی صورت حال کی طرف گیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ فوج کے گھروں میں گھسنے سے خواتین کی بے حرمتی ہوگی جس کا نتیجہ قتل خون کی صورت میں ہی نکل سکتا ہے کیونکہ لوگ بھی انتہائی جذبات میں تھے۔ چنانچہ میں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں اپنے آپ کو خود ہی فوج کے حوالے کرنا چاہئے۔ ادھر مجھے مقامی انتظامیہ - مرکزی حکومت اور فوج کے تیوروں کا بھی علم تھا کیونکہ ایک دن پہلے مجھے اپنے ایک عزیز علی احمد جان مرحوم غلام مصطفیٰ کے گھر سے بلا کر اپنے ساتھ ایک مکان میں لے گئے تھے جہاں میرے ماموں زاد بھائی محمد اسماعیل خان اور ریڈینٹ کے سیکرٹری ہمایوں بیگ میرے منتظر تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ صدر پاکستان (جنرل یحییٰ خان) کی طرف سے حکم آیا ہے کہ اس بغاوت کو پوری قوت سے کچل دیا جائے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ حکومت اس صورتحال کی سب سے زیادہ ذمہ داری تم پر ہی ڈال رہی ہے کیونکہ تم نے ہی جیپ پر لاؤڈ سپیکر لگا کر تقریریں کر کے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا۔ انہوں نے مجھے پیش کش کی کہ وہ مجھے بحفاظت گلگت سے باہر پہنچا سکتے ہیں بلکہ اگر جیل سے نکالے جانے والوں میں سے اور کوئی بھی جانا چاہئے تو اسے بھی لے جائیں گے میں نے کہا میرا اس طرح فرار گلگت کے لوگوں کے ساتھ غداری کے مترادف ہو گا جو میں کسی صورت میں نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا تھا۔

جب غلام مصطفیٰ کے ہاں آئندہ لائحہ عمل پر غور ہو رہا تھا تو میری ایک بار پھر جوہر علی سے جھڑپ ہوئی۔ اکثریت نے میرا ساتھ دیا اور فیصلہ ہوا کہ ہمیں اپنے آپ کو فوج کے حوالے کرنا چاہئے اور اس فیصلے کے مطابق ہم نے فوج پر فوج کے مقامی کمانڈر کو اطلاع دے دی کہ ہم اپنے آپ کو (سول حکام کے نہیں بلکہ) فوج کے حوالے کرنا چاہتے ہیں چنانچہ ہم (میں شیر والی پونیالی، الطاف حسین، کریم خان، سعید احمد، محمد عیسیٰ اور محمد علی انجینئر) ناردرن سکاؤٹس کے ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ہمیں الوداع کہا۔ فوج کے کمانڈر نے ہمیں آفیسرز میس کے ہال میں رکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جوہر علی کو بھی گرفتار کر کے لایا گیا اور رات بارہ

بچے کے قریب ہمیں دو دو کر کے ہتھکڑیوں میں باندھ کر فوجی اور پولیس گارڈز میں گلگت جیل پہنچایا گیا۔ میری مرضی کے خلاف مجھے جوہر علی کے ساتھ ہتھکڑی لگائی گئی۔ رات کو بھی اسی طرح دو دو کر کے ہتھکڑیوں میں بندھے رہے۔ صبح کسی بات پر ایک بار پھر میری جوہر علی سے جھڑپ ہو گئی جس سے فضا خاصی تلخ ہو گئی۔ لیکن اسی دن سہ پہر کو جوہر صاحب کو وہاں سے باہر جیل لے جایا گیا اور باقی ہم بہت اچھے دوستانہ ماحول میں رہے۔

ہمیں 27 دن تک دن رات ہتھکڑیوں میں بند رکھا گیا۔ مجھے سعید احمد کے ساتھ ہتھکڑی لگی تھی۔ کچھ دن کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا ہاتھ ہتھکڑی میں سے نکل سکتا ہے چنانچہ رات کو سوتے ہوئے میں ہتھکڑی سے ہاتھ نکال کر آرام سے سوتا اور سعید بھی۔ باقی ساتھی خاصی تکلیف میں رہے۔ رات کو نیند میں ایک کروٹ بدلنے کی کوشش کرے تو دوسرے کی چیخ نکلتی، شیر ولی، محمد عیسیٰ اور محمد علی تو دیسے بھی خاصے موٹے تھے۔ اس دوران ہمیں کسی قیدی یا وارڈر سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ البتہ پندرہ بیس دن کے بعد اس پابندی میں کچھ نرمی ہوئی جس کے بعد ہمارا کھانا عام طور پر سعید احمد ایڈووکیٹ کے گھر سے آتا رہا۔

ہماری جیل واپسی کے ساتھ ہی گرفتاریوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ جیل میں ان کے لئے جگہ بنانے کے لئے عمر قید اور لمبی مدت کی سزا پانی والی تمام زنانہ قیدیوں اور بہت سے حوالاتی مردوں کو بھی رہا کر دیا گیا۔ ہمارے بعد گرفتار ہونے والوں کے نام یہ ہیں۔

امیر حمزہ اور غلام مصطفیٰ ممبران مشاورتی کونسل، صوبیدار صفی اللہ بیگ، عبدالحمید، ذوالفقار علی، عبدالرحیم، لطیف حسن، غلام رسول، سلمان بیگ، خوشحال خان، قربان محمد، محمد ننگین دیدار علی، صوبیدار محمد ایوب، غلام محمد بٹ، محمد یونس، سرزمان، دیار محمد، غلام مرتضیٰ، عباس علی شاہ، عبدالقیوم، گل علی خان، فیفور شاہ، اچھری، فیفور شاہ، مجن محلہ، نثار ولی خان، عرب شاہ، غلام مصطفیٰ، مجن محلہ، غلام اکبر، ناد علی اور سلطان میر۔ ان میں سے امیر حمزہ اور غلام مصطفیٰ کو چند دن کے بعد رہا کر دیا گیا۔ نثار ولی اور فیفور شاہ آف مجن محلہ بھی چند دن ہی جیل میں رہے۔

جن لوگوں نے اس تحریک کے دوران پاکستان میں رہ کر خاصا کام کیا ان میں فضل الرحمن پونیالی، شیر ولی ایڈووکیٹ آف جنگلوٹ، غلام مصطفیٰ مالک قومی دواخانہ گلگت (غلام مصطفیٰ صاحب راولپنڈی سے واپسی پر کچھ مدت جیل میں بھی رہے) خلیل الرحمن پونیالی، مالک شاہ، متولی خان اور گلگت بلتستان اسٹوڈنٹس سنٹرل آرگنائزیشن کے ممبران خاص کر حشمت اللہ خان، محبوب علی خان، حسن خان، محمد عیسیٰ وغیرہ شامل ہیں۔

جن لوگوں نے گلگت میں جیل سے باہر رہ کر کام کیا ان میں سرفہرست کشرٹ کے چاچا گلہاز تھے۔ وہ ہمارے اور بیرونی دنیا کے درمیان رابطہ تھے۔ ہمارے خط اور پیغامات یہاں تک کہ

اخباری بیانات تک باہر لے جاتے اور جہاز سے راولپنڈی جانے والوں کے ساتھ وہاں بھیج دیتے اور باہر کے خط اور خبریں ہمیں پہنچاتے۔ ان کے علاوہ شکور محمد، یوسف جمال، ٹھیکہ دار فضل احمد، ٹھیکہ دار فقیر محمد، علی احمد جان نے بھی خاصا کام کیا۔ ممبران مشاورتی کونسل میں سے امیر حمزہ، غلام مصطفیٰ اور خاصی حد تک محمد خورشید بھی سرگرم تھے۔

حکام نے مجھ پر اور دوسرے وکلاء پر شدید قسم کے الزامات عائد کر کے ہمارے خلاف کیس رجسٹر کئے تھے۔ مجھ پر جتنی دفعات کے تحت کیس رجسٹر ہوا تھا ان کے تحت کل سزا تین سزائے موت اور 191 سال کی قید بنتی تھی۔ میں نے 14 دسمبر 1970ء کو اپنا عدالتی بیان لکھ کر عدالت میں پیش کیا جس میں میں نے مقامی انتظامیہ اور مرکزی حکومت پر بڑی سخت تنقید کی تھی چنانچہ حکام نے میرے اس بیان کو بھی میری طرف سے بغاوت کے ثبوت کی حیثیت دے دی۔

فروری 1971ء میں مقامی انتظامیہ نے ایف سی آر کے تحت ایک شاہی جرگہ ترتیب دیا جس کو ہمارے بارے میں فیصلہ دینے کا حکم ملا۔ اس دوران جوہر علی وغیرہ کو بھی جیل لایا گیا تھا، میں نے اور وکلاء نے ایک تحریری معاہدہ کیا تھا کہ ہم متحدہ اور منظم رہیں گے اور تمام فیصلے اجتماعی طور پر اور ایک دوسرے سے صلح مشورے سے کریں گے اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ حکومت نسلی، فرقہ وارانہ اور علاقائی بنیادوں پر ہم میں نفاق ڈالنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

جب جرگہ دار ہمارے بیانات لینے جیل آئے تو ہم نے اپنے فیصلے کے مطابق ان کے سامنے جا کر بیان دینے سے انکار کر دیا دوسرے دن صبح سویرے ہیڈ وارڈر غلام عباس نے مجھے باہر نکالا اور دھوکے سے لے جا کر دور ایک کوٹھری میں بند کر دیا اور وکلاء کے سوا دوسرے ملزموں کو جرگے کے سامنے بیان دینے کے لئے لے جایا گیا۔ میں کوٹھری سے چیختا چلاتا رہا لیکن یہ لوگ چلے گئے۔ وہاں بھی جوہر صاحب نے ایک بڑی غلطی کی۔ نقل اپنے پاس رکھے بغیر ہی ایک اہم دستاویز جرگہ والوں کے حوالے کر دی۔

کچھ دن کے بعد جرگے کے فیصلے کے مطابق جوہر علی، صفی اللہ بیگ، عبدالرحیم، عبدالحمید، صوبیدار ایوب، ناد علی، عباس علی شاہ، دیار محمد، غلام اکبر، گل علی خان، محمد یونس، غلام مرتضیٰ شاہ اور عرب شاہ کو بھی سزائیں دے کر سنٹرل جیل ہری پور بھیجا گیا۔ وکلاء سعید احمد، محمد عیسیٰ، الطاف حسین اور شیرولی پونیالی، کے علاوہ محمد علی انجینئر، غلام محمد بٹ، کریم خان اور لطیف حسن کو گویس قلعے بھیجا گیا۔ میں اور باقی ملزم گلگت میں ہی رہے۔ چونکہ میں جرگے کے سامنے پیش نہیں ہوا تھا اس لئے اس نے میرے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دیا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے ملزموں کے کیس عام عدالت کے سپرد کر دیئے گئے۔

گلگت کے حکام نے مجھے عوام کے سامنے ذلیل کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں

دیا۔ اس کا ایک موثر طریقہ انہوں نے یہ نکالا کہ عدالت میں ریمانڈ کے لئے پیشی پر مجھے وہ جیل سے عدالت تک ہتھکڑی پہنا کر پیدل لے جاتے۔ میں بیمار بھی تھا اور ڈاکٹر نے اس سلسلے میں میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی دیا تھا جسے پولیٹیکل ایجنٹ نے منسوخ کرا دیا۔ چنانچہ میں نے پیدل عدالت جانے سے ہی انکار کیا اس طرح تین ماہ تک میری عدالت میں حاضری کے بغیر ہی میرا ریمانڈ لیا جاتا رہا جو کہ حکومت کی طرف سے ایک سنگین قانون شکنی تھی۔ اس سے قبل جب میں ریمانڈ کے لئے عدالت میں پیش ہوتا تو ایس ڈی ایم (جو کہ ایک لمبی داڑھی والے احمد سعید نامی ایک مولوی صاحب تھے اور میں نے اپنے عدالتی بیان میں لکھا تھا کہ اگر لمبی داڑھی والا بیچ انصاف نہیں کرتا تو اس میں اور کھڑک سنگھ میں کوئی فرق نہیں) بار بار مجھے کہتا کہ تم نے اپنے بیان میں مجھے کھڑک سنگھ کہا ہے۔ کبھی کبھی میرے اور اس کے درمیان سوال و جواب بیت بازی کی شکل اختیار کرتا۔ مولوی صاحب بھی نہیں چاہتے تھے کہ میں عدالت میں پیش ہو کر اس کے ماتحتوں کی موجودگی میں اس کی تنہیک کروں چنانچہ وہ میری غیر حاضری میں ہی میرا جوڈیشل ریمانڈ دیتے رہے۔

فروری 71ء کے اوائل میں (جب ہمیں کسی سے ملنے یا بات کرنے کی اجازت نہیں تھی) ایک دن میں اپنی کوٹھری میں دوسرے وکلاء کے ساتھ بیٹھا تھا کہ ہنزہ کے ایک لکھے پڑھے قیدی سو جنگ (جس نے اپنا نام میر آف ہنزہ کے نام پر جمال شاہ رکھا تھا اور بڑا پیسے والا آدمی تھا) نے ہماری کوٹھری کے سامنے سے گذرتے ہوئے کھڑکی سے ایک چٹ اندر پھینک دی جس میں لکھا تھا کہ کشمیری حریت پسند ایک بھارتی جہاز اغوا کر کے لاہور لائے تھے جسے جلا بھی دیا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہاشم قریشی کا کارنامہ ہے جسے ہم نے ہائی جیکنگ کی تربیت دے کر مقبوضہ کشمیر بھیجا تھا۔ چند دن کے بعد ہم پر عائد پابندیوں میں کچھ نرمی ہوئی تو میں نے پرانے اخبارات منگوائے اور ان سے تفصیلات معلوم ہوئیں۔ پھر وسط اپریل میں خبر آئی کہ بھارتی جہاز کو اغوا کرنے والوں سمیت این۔ ایل۔ ایف اور محاذ رائے شماری کے سینکڑوں کارکنوں کو بھارتی ایجنٹ ہونے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔

شاہی قلعہ میں سات ہفتے

برصغیر میں انگریز راج کے دوران بہت سے انتہائی سخت جیلوں (جہاں انتہائی خطرناک مجرموں اور جو شیلے حریت پسند سزا یافتہ قیدیوں کو رکھا جاتا تھا) کے علاوہ کچھ ایسے تفتیشی مراکز بھی تھے جہاں سول اور ملٹری حکام انتہائی خطرناک مجرموں، تخریب کاروں اور جو شیلے سیاسی کارکنوں کو انسانیت سوز جسمانی اور ذہنی اذیتیں دیتے تھے۔ ان تفتیشی مراکز میں لاہور کے شاہی

قلعے کے ایک حصے میں قائم تفتیشی مرکز بھی شامل تھا۔ اس مرکز میں پاکستان کے ترقی پسند لیڈر حسن ناصر سمیت سینکڑوں افراد وحشیانہ تشدد کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے تھے۔

بھارتی جہاز گنگا کے اغواء کے سلسلے میں گرفتار ہونے والے میرے سینکڑوں ساتھیوں میں سے مقبول بٹ، ہاشم قریشی، اشرف قریشی، جی ایم لون، میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان، ڈاکٹر فاروق حیدر، جاوید ساغر، نصیر محمود وانی اور سعید شاہ ناز کی وغیرہ کے علاوہ لاہور میں زیر تعلیم کشمیری نوجوان کوٹلی کے ملک اعجاز مرحوم، عزیز قیصر، عمر فاروق، ملک صدیق اور ملک نواز وغیرہ بھی شاہی قلعہ لاہور میں تختہ مشق بنے۔ ان میں سے اولڈ کر دس افراد کے ساتھ تو انتہائی انسانیت سوز سلوک ہوا۔

میں نے بھی گنگا ہائی جیکنگ کے سلسلے میں 10 جولائی سے اواخر اگست 1971ء تک کے تقریباً سات ہفتے شاہی قلعے میں گزارے۔ اس دوران کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات کی مختصر سی روداد پیش خدمت ہے۔

10 جولائی 1971ء کو مجھے عدالت لے جانے کے بہانے دھوکے سے گلگت جیل سے نکال کر پولیس گارڈ کے ساتھ ہوائی جہاز میں راولپنڈی پہنچایا گیا جہاں ایئرپورٹ پر شاہی قلعہ لاہور کا ایک پولیس دستہ ایک بند پولیس گاڑی سمیت ہمارا منتظر تھا چنانچہ اس میں ہم لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات آٹھ بجے کے قریب ہم شاہی قلعہ لاہور پہنچے۔ مجھے نیچے گیٹ کے پاس رکھا گیا اور تروی بیگ اور لاہور کا پولیس آفیسر اوپر چلے گئے۔ شدید گرمی کی وجہ سے پیاس سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی ایک گنداسا منگہ تھا اور اس پر ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پانی پینا چاہا تو شاہی قلعے کے ایک سپاہی نے مجھے انتہائی تحکمانہ انداز میں منع کیا۔ میری خودداری پر شاہی قلعہ کا یہ پہلا حملہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے اوپر دفتر لے جایا گیا۔ وہاں ایک انسپکٹر نے دو چار سنائیں۔ اس کے بعد مجھے ایک ہال میں لے جایا گیا۔ گلگت پولیس کا سپاہی عبدالرحمن اب بھی میری ہتھکڑی پکڑے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے رخصت کیا گیا۔ اس کے جاتے ہی ایک سپاہی نے مجھے تھپڑ مارا تو میری ٹوپی گر گئی۔ مجھے کپڑے اتارنے کے لئے کہا گیا تو میں نے بش شرٹ اور پتلون اتاری۔ ایک افسر نے گندی سی گالی دے کر مجھے ہال میں رکھے ہوئے جسمانی اذیتیں دینے کے وہ اوزار دکھائے جن سے بقول اس کے وہ مدافعت کی فولادی قوت رکھنے والوں سے بھی سچ اگلاتے ہیں۔ میں پہلے تو ان اوزاروں کو دیکھ کر خاصا گھبرا گیا پھر دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو مجھے اس صورتحال کا مقابلہ مردانہ وار کرنا چاہیے کیونکہ یہی اس کا واحد علاج تھا۔ خاصی دیر کے بعد مجھے بڑی عمارت سے الگ بنی ہوئی ایک لمبی عمارت کی ایک کوٹھری میں ڈالا گیا جو دو آہنی دروازوں کے اندر تھی۔ سونے کے لئے سینٹ کا بنا ایک دیوان جس پر انگریزوں کے زمانے کا ایک پھٹا پرانا کبل تھا اور اس پر جویں اور پتھر پیرید

کرتے نظر آرہے تھے۔ کونے میں رفع حاجت کے لئے ایک چھوٹی سی جگہ بنی ہوئی تھی جس پر باہر ڈیوٹی دینے والے چار سپاہیوں کی نظر براہ راست پڑتی تھی۔ کوٹھری میں تیز روشنی تھی چنانچہ رفع حاجت کے سلسلے میں بڑی بے شرمی سے کام لینا پڑتا تھا۔ مجھے رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ اس کوٹھری میں قیام پاکستان سے پہلے یکے بعد دیگرے کانگریسی لیڈروں پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور جے پرکاش نارائن وغیرہ کو رکھا گیا تھا۔

شاہی قلعہ پہنچنے کے کوئی ایک ہفتہ بعد ایک دن مجھے دفتر میں ایک پولیس افسر کے پاس لے جایا گیا۔ جس نے میرا استقبال انتہائی گندی گالیوں کی بوچھاڑ سے کیا۔ میں نے اس پر احتجاج کیا کیونکہ میں نہ کسی کو گالی دیتا ہوں نہ ہی کسی کی طرف سے گالی مجھ سے برداشت ہوتی ہے۔ پولیس افسر (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ڈی ایس پی ملک صدیق تھا) کو جب میری یہ کمزوری معلوم ہوئی تو اس نے گالیوں کی مزید بوچھاڑ کر دی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کھڑے سپاہی نے مجھے دو تین تھپڑ اور لاتیں رسید کیں۔ اس کے بعد ملک صدیق ایک کانغذ سے پڑھ کر مجھ سے سوالات کرنے لگا۔ میرے ہر جواب پر میرے ساتھ کھڑا سپاہی مجھے تھپڑیا لات رسید کر کے اور گندی سی گالی دے کر کہتا۔ صاف صاف کیوں نہیں جانتے ہو کہ تم بھارت کے تنخواہ دار ایجنٹ ہو۔ کوئی دو گھنٹے کے اس سوال و جواب کے بعد مجھے اپنی کوٹھری کی طرف لے جایا گیا اور جاتے جاتے ملک صدیق نے کہا اگر تم نے صاف صاف اقرار نہیں کیا کہ تم بھارت کے تنخواہ دار ایجنٹ ہو تو آنے والا کل تیری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ کوٹھری میں پہنچا تو گالیوں کے نتیجے میں پہنچنے والی ذہنی اذیت کے علاوہ تھپڑوں اور لاتوں کی وجہ سے میرا چہرہ اور بدن بری طرح دکھ رہا تھا۔

دوسرے دن ملک صدیق کے دفتر میں میرا استقبال پھر انتہائی فحش قسم کی گالیوں سے ہوا۔ اس کے بعد ڈیڑھ گھنٹے تک مرغا بنائے رکھا گیا۔ میں ذرا سستانے لگتا تو ساتھ والا سپاہی لات رسید کر دیتا۔ آخر جب میں تقریباً بے ہوش ہونے لگا تو مجھے بیچ پر بیٹھنے کے لئے کہا گیا اور ساتھ ہی یہ حکم بھی صادر ہوا کہ اب سچ بتاؤ کہ بھارت کی جاسوسی تمہارے علاوہ اور کون کون کر رہا ہے۔ میں نے پھر کہا کہ نہ میں بھارت کا جاسوس ہوں نہ میرا کوئی ساتھی۔ اس پر مجھے ڈنڈ پلینے کے لئے کہا گیا۔ ڈنڈ پلینے کے دوران بھی لاتیں ماری گئیں۔ آخر میں تھک کر زمین پر ہی لیٹ گیا تو مزید ڈنڈ پلینے کی طاقت ہی نہیں تھی اس کے بعد مجھے تھوڑی دیر بیچ پر بیٹھانے کے بعد کوٹھری کی طرف لے جایا گیا اور ساتھ ہی گزشتہ دن والی وارننگ پھر دی گئی۔ میں درد کی وجہ سے چل بھی نہیں سکتا تھا چنانچہ تقریباً گھسیٹ کر مجھے کوٹھری تک پہنچایا گیا اور جاتے ہی میں مسہری پر گر گیا۔ رات عجیب سے ذہنی اور جسمانی کرب میں گزری۔

تیسرے دن ملک صدیق کے دفتر پہنچایا گیا تو حسب معمول فحش گالیوں سے استقبال کے بعد میرے ہاتھ اور پیر رسی سے باندھے گئے اور ایک ڈنڈا میرے بازوؤں کے آگے اور گردن

کے پیچھے سے گزارا گیا جس سے انتہائی شدید تکلیف ہوئی اس کے بعد ملک صدیق نے بجلی کے دو تار ہاتھ میں لئے اور میرے بدن کو چھوتا رہا۔ تاروں کے بدن سے چھو جانے کے ساتھ ہی میرے سارے بدن میں بجلی دوڑتی اور میں اچھل جاتا اس کے بعد مجھ سے کہا جاتا کہ میں تسلیم کروں کہ میں بھارت کا ایجنٹ ہوں۔ میرے انکار پر پھر بجلی کا جھٹکا لگایا جاتا۔ یہ سلسلہ میرے پیروں سے شروع ہوا تھا اور گردن تک پہنچا تھا اور اب سر کی باری تھی۔ تقریباً چالیس جھٹکے لگ چکے ہوئے مجھے معلوم تھا کہ جو شخص ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے اسے بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے ہیں اور عموماً وہ ان جھٹکوں سے ٹھیک ہو جاتا ہے اس لئے اگر صحیح ذہن والے کو بجلی کے جھٹکے دیئے جائیں تو ظاہر ہے وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے گا، یہ خیال آتے ہی میں لرز اٹھا اور ساتھ ہی میں نے اپنے آپ میں ایک عجیب سی قوت محسوس کی چنانچہ میں نے یا اللہ کہہ کر ڈنڈے پر اپنی پوری قوت صرف کی اور ساتھ ہی گر کر بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو اپنی کوٹھری میں فرش پر پڑا تھا اور دن ڈھل چکا تھا۔

اگلے دو دن مجھے ”چھٹی“ دی گئی۔ ان میں سے پہلا دن تو میں نے ذہنی اور جسمانی کرب میں گزارا۔ لیکن شام کو مجھے اچانک یاد آیا کہ میں نے ایک بار مادر وطن کی مٹی ہاتھ میں لے کر، ایک بار اپنے خون سے اور کئی بار ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھ کر اور اپنے ضمیر کو گواہ رکھ کر حلف اٹھایا ہے کہ میں قومی آزادی کے حصول کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ یہ خیال آتے ہی کہ مجھے یہ اذیتیں اپنے مشن کی تکمیل اور اپنے حلف کی تعمیل کے سلسلے میں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔ میرے بدن میں سکون قلب کی ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی۔ میرا ذہنی کرب اور جسمانی درد عجیب سے لذت آمیز سکون میں تبدیل ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے چند منٹ پہلے والا پرمردہ امان اللہ ایک ہشاش بشاش انسان میں تبدیل ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ حصول آزادی اور اس سلسلے میں ملنی والی اذیتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا میرا عزم بھی کئی گنا بڑھ گیا۔

دوسرے دن میں ایک نئے انسان کے روپ میں اور ہر اذیت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے عزم کے ساتھ ملک صدیق کے دفتر پہنچا۔ مجھے وہاں لے جانے والے سپاہی بھی میری طرف بار بار دیکھتے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے تین دن کی اذیتوں کی وجہ سے میں حوصلہ ہار چکا ہوں گا۔ لیکن میں ایک نیا عزم لئے ہوئے تھا۔ ملک صدیق نے میری طرف گھور کے دیکھنے کے بعد مجھ سے پوچھا آیا میں اب سچ بولوں گا۔ میں نے کہا میں گزشتہ چار پانچ دن سے سچ بول رہا ہوں اور آخری دم تک یہی سچ بولوں گا۔ اس پر اس نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد مجھے ایک سوال نامہ تھما دیا کہ ان سوالوں کے جواب تفصیل سے لکھ کر لاؤ اور مجھے کچھ کاغذ اور قلم تھما کر کوٹھری کی طرف بھیج دیا۔ غالباً میری ”چھٹی“ کے دو دنوں کے دوران فیصلہ ہوا تھا کہ مجھ پر مزید تشدد کرنے

کی بجائے مجھ سے تحریری بیان لیا جائے کوٹھری میں پہنچ کر میں نے سوالنامہ پڑھا۔ غالباً اٹھارہ سوال تھے اس میں محاذ رائے شماری اور این ایل ایف کے قیام کے پس منظر اور مقصد۔ نظریہ خود مختار کشمیر کا نظریہ پاکستان کے منافی ہونے، ہاشم قریشی اور مقبول بٹ کے بھارتی ایجنٹ ہونے محاذ اور این ایل ایف کو بھارت کی طرف سے مالی امداد ملنے، بھارتی جہاز گنگا کا بھارت کے ایما پر اغوا کرانے۔ میرے اپنے بھارتی سفارت خانے سے رابطے جیسے مفروضوں کے بارے میں سوال تھے۔ میں نے ہر سوال کا مفصل، مدلل اور واقعاتی ثبوتوں کی مدد سے جواب دیتے ہوئے ثابت کیا کہ این ایل ایف اور محاذ رائے شماری محب وطن تنظیمیں ہیں اور بھارت کو اپنی آزادی کے غاصب کی حیثیت سے اپنا دشمن سمجھتی ہیں۔ مقبول بٹ اور ہاشم کشمیری حریت پسند ہیں۔ بھارت کی طرف سے ہمیں مالی امداد ملنے کا الزام سراسر بہتان ہے۔ جہاز کے اغوا میں بھارت کا کوئی ہاتھ نہیں۔ میرا بھارتی سفارت خانے سے کوئی رابطہ نہیں اور خود مختار کشمیر کا نظریہ نظریہ پاکستان کے منافی نہیں نہ ہی یہ پاکستان کے قومی مفاد کے خلاف ہے۔

56 بڑے صفحات پر لکھے گئے یہ جواب میں نے دوسرے دن ملک صدیق کو بھیج دیئے۔ یہ جواب میں نے انگریزی میں لکھے تھے۔ میں پورے دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دستاویز ادبی معیار، زبان اور ٹھوس دلائل کے لحاظ سے میری زندگی کی بہترین تحریر تھی اور اس وقت بھی مجھے اس کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے شاہی قلعہ کے حکام سے مزید کانڈ مانگا تاکہ میں اس کی نقل بنا کر اپنے پاس رکھ سکوں لیکن کانڈ دینے سے انکار کیا گیا۔ اس کے بعد میں نے شاہی قلعہ والوں سے کہا کہ میرے ذاتی پیسے ان کے پاس ہیں ان میں سے مطلوبہ پیسے لے کر مجھے دستاویز کی فوٹو سٹیٹ کاپی بنا کر دی جائے لیکن میری یہ درخواست بھی نامنظور ہوئی (رہائی کے بعد میں نے ہائی جیکنگ کیس کے دوران وکلاء صفائی کے ذریعہ عدالت سے درخواست کی کہ شاہی قلعہ میں دیا ہوا میرا یہ بیان عدالت میں پیش کیا جائے لیکن پولیس نے مختلف بہانے بنا کر ایسا کرنے سے انکار کیا۔ دراصل اس میں درج ٹھوس دلائل اور ناقابل تردید واقعات پولیس کے لئے پریشان کن تھے اس لئے اس نے یہ دستاویز عدالت میں پیش ہی نہیں کی) اس طرح میں اپنی زندگی کی بہترین تحریر کی کاپی اپنے پاس رکھنے سے محروم رہا۔ اس کے بعد کئی دن تک کوئی نہیں آیا۔ ایک شام میں کوٹھری میں بیٹھا تھا کہ سپاہی آ کر مجھے بڑی عمارت کے پچھلے دروازے سے اوپر لے گئے۔ اوپر ایک کمرے میں انسپکٹر احمد خان تہبند باندھے ایک چارپائی پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے مجھے بھی (کچھ شریفانہ لہجے میں) دوسری چارپائی پر بیٹھنے کے لئے کہا جس سے مجھے خاصی حیرانگی ہوئی کیونکہ شاہی قلعے میں کسی قیدی کو انسان سمجھا جانا ایک انسانی بات تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ایک کپ چائے بھی دی گئی۔ یہ بھی ایک غیر متوقع بات تھی۔ اس کے بعد احمد خان نے ایک اخبار اٹھایا اور مجھ سے افسوس کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میرا عبدالقیوم کا پولیس تشدد

سے انتقال ہو گیا ہے اور ساتھ ہی اخبار سے خبر پڑھنے لگا۔ میں نے اخبار مانگا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ اس میں اور بھی بہت سی خبریں ہیں اور تم وہ خبریں نہیں پڑھ سکتے۔ احمد خان کی بات سنتے ہی مجھے سکتہ سا ہو گیا اور میری نظروں کے سامنے میرا قیوم صاحب کی جوان بیٹیاں اور اکلوتا بیٹا آگئے اور میں سوچنے لگا اب ان کا کیا ہو گا۔ میں خاصی دیر ان خیالوں میں گم رہا، اس کے بعد احمد خان نے ایک بار پھر مجھ سے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا مسٹر امان اللہ میرا قیوم تو اس دنیا سے چلے گئے۔ اب تم ساری ذمہ داری ان پر ڈال کر اپنے آپ کو کیس سے فارغ کیوں نہیں ہوتے ویسے بھی میرے اقبال جرم کیا تھا۔ میں نے کہا میں میرا قیوم کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کسی صورت میں بھی بھارتی ایجنٹ نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے آپ کو رہا کرانے کے لئے اپنے ایک ساتھی پر جو اس تحریک پر قربان ہو گیا ہے اور اب اس دنیا میں نہیں، ایسا بے بنیاد الزام کیسے لگا سکتا ہوں۔ نہیں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اس پر احمد خان نے کہا اچھا تمہاری مرضی۔ لیکن یاد رکھو اپنی اس حماقت پر عمر بھر پچھتاؤ گے کیونکہ اب جو تمہارا حشر ہو گا تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ کہہ کر اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور وہ مجھے اپنی کونٹھری میں لے گئے (پانچ ماہ بعد گلگت جیل میں مجھے پتہ چلا کہ میرا قیوم صاحب زندہ ہیں اور ان لوگوں کے خلاف ایک خصوصی عدالت میں مقدمہ شروع ہوا ہے۔ احمد خان مجھ سے میرا صاحب کے خلاف بیان لینے اور ساتھ ہی مجھے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کے لئے یہ چال چلا تھا)

میری کونٹھری کے عقب میں واقع کونٹھری سے عموماً کسی نوجوان کی دل ہلا دینے والی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ میں نے ایک دن موقع پا کر ڈیوٹی والے سپاہی شمشیر خان سے اس بارے میں پوچھا (یہ ملک صدیق کی طرف سے مجھ پر تشدد سے پہلے کی بات ہے) شمشیر خان گارڈ والوں میں سے واحد اردو بولنے والا تھا۔ باقی سب پنجابی تھے۔ چونکہ میں بھی اردو بولتا تھا، اس لئے مجھے کچھ اندازہ سا ہو گیا تھا کہ شمشیر خان کو مجھ سے کچھ ہمدردی ہے۔ اس نے کہا آپ کے ساتھ والی کونٹھری میں ایک نوجوان ہے جسے خسی کر دیا گیا ہے یعنی نامرد بنایا گیا ہے اس لئے درد سے ایسی چیخیں مار رہا ہے۔ یہ سن کر میرے رونگٹھے کھڑے ہو گئے۔

ایک دن احمد خان کامیری کونٹھری کے سامنے سے گذر ہوا۔ اس نے بڑے طنزیہ انداز میں میری خیریت پوچھی اور ساتھ ہی کہا کہ تمہارا دوست میر منان تمہارے ساتھ والی کونٹھری میں ہے۔ اس کے بعد ساتھ والی کونٹھری سے کسی عمر رسیدہ انسان کی چیخیں سنائی دینے لگیں اور میں یہ سمجھ کر یہ چیخیں میر منان صاحب کی ہیں، لرز اٹھتا۔ اس دوران تقریباً روزانہ سپاہی آکر مجھ سے پوچھتے کہ آیا میں اقبالی بیان دینا چاہتا ہوں میرے انکار پر وہ مجھے گالیاں دیتے واپس چلے جاتے۔

مجھے بعد میں یعنی رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ دونوں کہانیاں مجھے ڈرا کر مجھ سے اقبالی

بیان لینے کے لئے گڑھی گئی تھیں اور دونوں صورتوں میں ساتھ والی کوٹھری میں ریکارڈ کی ہوئی چیخوں، رونے اور آہ وزاری کے ریکارڈ بجائے جاتے تھے تاکہ میں ان سے ڈر کر اقبال جرم کروں۔

ملک صدیق کی طرف سے تشدد اور سوالنامے کے جواب کی صورت میں اپنا بیان اس کے حوالے کرنے کے بعد مجھے جو ذہنی سکون ملا تھا اس کے نتیجے میں میرا حافظ تازہ۔ میری آواز انتہائی سریلی اور میرا حوصلہ بہت بلند ہو گیا تھا۔ دراصل صحیح نوعیت کا ذہنی سکون انسان کو بڑی خوبیاں عطا کرتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ذہنی سکون انسان کی سب سے بڑی دولت ہے اور یہ دولت انسان کو عظیم مقاصد کے حصول کے لئے دی جانے والی قربانیوں سے ہی ملتی ہے۔

اس سکون کے دوران میرا حافظ اتنا تیز ہو گیا کہ عمر بھر کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے علاوہ اقبال کے اشعار بھی میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ ادھر آواز بھی انتہائی سریلی ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں دن بھر علامہ اقبال کے شعر گنگناتا رہتا۔ تشدد کے بارے میں افسوس صرف اتنا تھا کہ جس اذیت کی ہمیں بھارتیوں سے توقع تھی وہ پاکستانیوں کی طرف سے مل رہی تھی۔

میں جب اقبالیات گنگناتا تھا تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میں لاؤڈ اسپیکر کے سامنے گنگنا رہا ہوں۔ میں عموماً نیند میں باتیں کرتا ہوں اور یہاں بھی کرتا تھا۔ دراصل انسان نیند میں سچی باتیں کرتا ہے۔ چنانچہ شاہی قلعے والوں نے کوٹھری کی دیوار میں باہر کی طرف سے ٹیپ ریکارڈ فٹ کر دیا تھا تاکہ نیند میں ہونے والی باتیں ٹیپ ہو جائیں۔ یہ انتظام غالباً شاہی قلعے کے تمام مکینوں کے لئے ہوتا تھا۔ مجھے رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ جب میری نیند والی باتوں اور اقبالیات کے ٹیپ پولیس اور ملٹری افسروں کی ایک ٹیم کو سنائی گئیں تو ایک اعلیٰ فوجی افسر نے کہا کہ جو شخص اقبال اور اس کے نظریہ خودی کا اتنا شیدائی ہو اور پرسوز اور پردرد آواز میں اقبالیات گنگناتا ہو وہ ہندو کا ایجنٹ ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھے شاہی قلعے میں تین ہفتوں سے زیادہ ہو گئے تھے۔ گرمی بھی غضب کی تھی اس سارے عرصے میں ایک ہی جوڑہ کپڑے (بش شرٹ اور پتلون) پہنے رہا تھا جس کی وجہ سے جسم اور کپڑوں سے ناقابل برداشت بدبو آ رہی تھی۔ جوئیں بھی درجنوں کے حساب سے کپڑوں پر ریختی رہتی تھیں۔ اس دوران میرے بار بار کے مطالبے کے باوجود نہ نہانے کے لئے پانی ملا تھا نہ کپڑے دھونے کے لئے۔ ایک دن میری کوٹھری کے سامنے سے ایک فوجی ڈاکٹر کا گزر ہوا تو میں نے اسے آواز دے کر کہا ڈاکٹر صاحب آپ لوگوں کا پیشہ تو دشمن کے زخمیوں کا بھی بہترین علاج کرنے کا متقاضی ہے۔ میں تو صرف ایک ملزم ہوں۔ مجھ پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوا ہے دیکھیں میرے جسم اور کپڑوں سے کتنی بدبو آ رہی ہے۔ میں نے یہ باتیں انگریزی میں کیں۔ ڈاکٹر چونک سا گیا پھر کہنے لگا کہ ان باتوں کا اتنا خیال ہے تو ایسے کام کیوں کرتے ہو جس کے نتیجے

میں یہاں پہنچے ہو۔ میں نے کہا میں نے کوئی غلط کام کیا ہے یا نہیں اس کا فیصلہ تو عدالت کرے گی۔ بہر حال اس نے ساتھ والے پولیس افسر سے کہا کہ مجھے نہانے اور کپڑے دھونے کے لئے پانی اور صابن دی جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد شوقا (بھنگی) ایک بالٹی پانی اور ایک ٹکیہ کپڑے دھونے کی صابن لے آیا۔ میں نے کوٹھری میں ہی نہایا اور کپڑے دھوئے۔ صابن والا پانی کوٹھری کے نشیبی حصے میں جمع ہو گیا۔ اتنے میں شوقا آیا اور کہنے لگا پانی جلدی سے باہر نکال دو۔ میں پیروں سے چکنا پانی باہر نکالتے ہوئے پھسل کر گر گیا اور میرے سر کا پچھلا حصہ دیوان کے کونے سے ٹکرا گیا اور میں تقریباً نیم بے ہوش ہو کر پانی میں خاصی دیر تک پڑا رہا۔ اس نیم بے ہوشی میں میں شوقے کی انتہائی غلیظ گالیاں سن رہا تھا جو لوہے کی سلاخوں کے باہر کھڑا مجھے پانی جلدی نکالنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ذرا حواس بحال ہوئے تو میں نے کھڑے ہو کر ہاتھوں اور پیروں سے پانی باہر نکال دیا اور شوقے کی گالیوں سے نجات حاصل کی۔

میں شروع سے ہی کم خوراک واقع ہوا ہوں چنانچہ شاہی قلعے کی دو روٹیوں میں سے ایک ہی کھاتا تھا اور ایک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے چڑیوں کو پھینکتا تھا۔ میرا کھانا آتے ہی سینکڑوں چڑیاں میری کوٹھری کے پاس آ جاتیں اور روٹی کے ٹکڑے اٹھا کر لے جاتیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اندر کوٹھری میں بھی آنے لگیں یہاں تک کہ کچھ میرے دیوان تک بھی پہنچ جاتیں کیونکہ ان کے دلوں سے ڈر نکل گیا تھا۔ ایک چڑیا لنگڑی تھی۔ ایک دن میں نے روٹی کے ٹکڑے دیوان پر ہی پھیلائے تو وہ چڑیا بھی آگئی اور میں نے اسے پکڑ لیا۔ اس کی ٹانگ کا جوڑ مل گیا تھا۔ میں نے اسے ذرا کھینچ کر ٹھیک کر دیا اور اس کی گردن پر اپنی کمرل کا ایک دھاکہ باندھ دیا تاکہ پہچانی جاسکے۔ دوسرے دن دیکھا تو وہ ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

اس کوٹھری میں مجھے کوئی ایک مہینہ ہوا تھا۔ ایک دن اچانک مجھے وہاں سے نکال کر باہر کی طرف بنی کوٹھریوں کی قطار میں سے ایک میں ڈال دیا گیا (رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ میرے بعد میری کوٹھری میں بنگال کے شیخ مجیب الرحمن کو رکھا گیا) باہر والی قطار کی دوسری یا تیسری کوٹھری میں جی ایم لون صاحب تھے جنہوں نے مجھے وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھ کر آواز دی اور کہنے لگے کیا تم بھی یہاں ہو؟ میری اور ان کی کوٹھری کے درمیان ایک کوٹھری تھی سو ہم ایک دوسرے کی آواز سن سکتے تھے لیکن بات کرنے کی اجازت نہیں تھی اس کا علاج میں نے یہ نکالا کہ میں گانے کے طرز پر کشمیری زبان میں ان کی حوصلہ افزائی کرتا۔ دوسری طرف تیسری کوٹھری میں سعید شاہ ناز کی صاحب تھے جن کی باتوں سے ہی میں نے انہیں پہچان لیا۔ وہ سپاہیوں سے اونچی آواز میں بات کرتے تھے۔ چند دن کے بعد انہیں وہاں سے نکال کر اور کہیں لے جایا گیا۔ میں نے انہیں اپنی کوٹھری کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا ان کا حلیہ عجیب سا ہو گیا تھا جسے

دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے انہیں آواز دی سلام کیا، خیریت پوچھی اور حوصلہ افزائی کی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے لیکن سپاہی انہیں کھینچ کر آگے لے گئے۔

میری ساتھ والی کوٹھری میں کوئی نوجوان تھا۔ اس کی آواز ہمارے ایک ساتھی نصیر محمود وانی کی سی تھی چنانچہ میں اسے نصیر وانی ہی سمجھا اور کشمیری زبان میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ نصیر وانی نہیں بلکہ جموں کا کوئی ڈوگرہ نوجوان تھا۔

اگست کے اواخر میں ایک دن صبح سویرے ہی سپاہی آئے اور مجھے نکال کر ملک صدیق کے دفتر لے گئے۔ ملک نے حسب معمول چند غلیظ گالیوں سے میرا استقبال کیا اور کہا تمہیں باہر لے جایا جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ہتھکڑیوں میں جکڑا بند پولیس گاڑی میں جی ٹی روڈ پر راولپنڈی کی طرف جا رہا تھا۔ انچارج سب انسپکٹر فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا اور تین سپاہی پیچھے میرے ساتھ۔ راستے میں سب انسپکٹر نے مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ مجھے پھانسی دینے کے لئے لے جایا جا رہا ہے۔ سپاہیوں میں سے ایک شریف سانوجوان تھا جو سب انسپکٹر کی باتیں سن کر مسکرایا (غالباً قصداً اور میں سمجھ گیا کہ سب انسپکٹر مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے) میں سارے راستے بالکل خاموش رہا۔ رات آٹھ بجے ہم راولپنڈی کے بی ڈویژن تھانے کے پاس پہنچے تو وہاں گلگت کا سب انسپکٹر (جو اب غالباً انسپکٹر بن گیا تھا) تروی بیگ ہمارا منتظر تھا۔ اس نے لاہور والوں کو چائے پلائی۔ مجھے پوچھا تک نہیں۔ اس کے بعد وہ لاہور کا سب انسپکٹر اندر تھانے میں چلے گئے۔ مجھے بھی تھانے کے مین گیٹ سے اندر لے جایا گیا۔ حوالاتوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک طرف کے حوالات میں درجن بھر طوائف بیٹھی ہنسی مذاق کر رہی ہیں اور دوسری طرف کا حوالات مردوں سے بھرا ہے جن کی حرکتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ طوائفوں کے دلال ہیں اور پولیس والے مجھے رات کو ان کے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے سپاہی سے کہا کہ وہ مجھے اندر تھانے کے انچارج کے پاس لے جائے چنانچہ تھوڑے سے تذبذب کے بعد وہ شریف سانوجوان مجھے اندر لے گیا۔ ہمیں دیکھتے ہی تروی بیگ اور لاہور والے سب انسپکٹر نے سپاہی کو بری طرح ڈانٹ دیا کہ وہ مجھے کیوں اندر لایا ہے۔ میں ان کی اس ڈانٹ ڈپٹ کو نظر انداز کر کے سامنے بیٹھے مقامی تھانے کے انچارج سے مخاطب ہوا اور انگریزی میں اس سے کہا کہ میں ایک لاگربوٹ ہوں مجھ پر ابھی تک کوئی الزام بھی ثابت نہیں ہوا ہے۔ کیا آپ کا ضمیر آپ کو اجازت دیتا ہے کہ آپ مجھے رات کو ان طوائفوں یا ان کے دلالوں کے ساتھ رکھیں۔ انچارج نے مجھ پر اوپر سے نیچے تک ایک نظر ڈالی اور مجھے باہر کھڑا ہونے کو کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد تروی بیگ اور لاہور والا افسر باہر نکلے اور مجھے گاڑی میں بٹھایا۔ غالباً میری باتوں سے متاثر ہو کر پنڈی والے تھانیدار نے مجھے دلالوں کے ساتھ رکھنے سے انکار

کیا تھا اس کے بعد مجھے سول لائنز تھانے لے جایا گیا وہاں بھی جگہ نہیں تھی۔ آخر رات دیر سے ہم چکالہ تھانے پہنچے جس کا ایک حوالات خالی تھا اور مجھے اس میں ڈالا گیا۔ حوالات کا تین چوتھائی حصہ پیشاب سے تالاب بنا ہوا تھا۔ بدبو بھی ناقابل برداشت تھی۔ بہر حال میں نے ایک کونے میں سمٹ کر رات گزاری۔ دوسرے دن میں نے مقامی ایس ایچ او سے کہا کہ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ کے خوراک کی ذمہ داری آپ کو یہاں لانے والوں پر ہے۔ میں نے کہا میرے پیسے ان کے پاس ہیں۔ اگر حکومت مجھے کھانا نہیں دے سکتی ہے تو ان پیسوں سے مجھے کھانا منگوا دیں۔ ایس ایچ او نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد باہر ہوٹل سے ایک لڑکے کو بلایا اور اسے کہا کہ مجھے کھانا دے دے میں بعد میں پولیس والوں سے پیسے لے کر دوں گا۔ لڑکے نے کہا جناب اگر مجھے پیسے نہیں ملے تو میرا ایک ہفتے کا کمیشن چلا جائے گا۔ بہر حال میں نے لڑکے کو مطمئن کیا کہ اسے پیسے ضرور ملیں گے چنانچہ وہ جا کر میرے لئے کھانا سگریٹ اور اخبار بھی لایا۔ اخبار کی شکل میں نے تقریباً دو ماہ سے نہیں دیکھی تھی چنانچہ کھانا کھاتے ہوئے میں اخبار بھی پڑھتا رہا۔ اتنے میں لاہور والا سب انسپکٹر وہاں سے گزرا اور مجھے اخبار پڑھتے دیکھ کر شور مچانے لگا کہ اس کو اخبار کس نے دیا ہے۔ چنانچہ اخبار مجھ سے چھین لیا گیا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد تردی بیگ سامنے سے گزرا۔ میں نے اسے آواز دی اور سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر اس کا گلا پکڑا اور اس سے پوچھا کہ اس نے مجھے کھانے کے بغیر کیوں رکھا۔ اس نے شور مچایا۔ چنانچہ دوسرے سپاہی آکر اسے مجھ سے چھڑا لے گئے۔

موسم کی خرابی کی وجہ سے جہاز گلگت نہیں جاتا تھا اس لئے مجھے پنڈی میں رکھا گیا تھا۔ چوتھے دن فلائٹ ہوئی تو مجھے حوالات سے نکال کر گاڑی میں بٹھایا گیا۔ اتنے میں مجھے یاد آیا کہ ہوٹل والے لڑکے کو پیسے دینے ہیں۔ میں نے لاہور والے سب انسپکٹر سے کہا کہ وہ میرے پیسوں میں سے میرے کھانے سگریٹوں اور اخبار کے پیسے ہوٹل والے کو دے دیں۔ اس نے مجھے گندی سی گالی دے کر دین کا دروازہ بند کرنا چاہا تو میں نے اسے روکا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ لڑکا دور کھڑا دیکھ رہا ہے۔ قبل اس کے کہ سب انسپکٹر گاڑی کا دروازہ بند کرے۔ میں نے دو سو روپے کی اپنی نئی کراکلی ٹوپی لڑکے کی طرف پھینک دی اور اسے کہا کہ میں اسے یہ ٹوپی ہی دے سکتا ہوں۔ اتنے میں گاڑی کا دروازہ بند کر دیا گیا اور ہم ایئرپورٹ کی طرف چل دئے اور جہاز میں گلگت روانہ ہو گئے۔

شاہی قلعے کے یہ سات ہفتے میری زندگی کے بدترین دن بھی تھے۔ اور بہترین بھی۔ بدترین اس لئے کہ جو ذہنی اور جسمانی اذیت مجھے یہاں ملی اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا خاص کر افسروں اور سپاہیوں سے لے کر بھنگی تک کی طرف سے ملنے والی انتہائی گندی اور ذلیل گالیاں اور وہ بھی تقریباً مسلسل میرے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ مجھے زندگی میں کبھی بھی اس

قسم کی ذہنی اور جسمانی اذیت کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا۔ اس اذیت میں مزید اضافہ اس لئے بھی ہوتا تھا کہ یہ مجھے پاکستانیوں کی طرف سے مل رہی تھی جبکہ مملکت پاکستان کے خلاف کوئی بات کبھی ہمارے ذہن میں بھی نہیں آئی تھی۔

یہ سات ہفتے میری زندگی کے بہترین دن اس لئے تھے کہ مجھے ذہنی اور جسمانی اذیتیں برداشت کرنے کے بعد یہ سوچ کر کہ میں یہ اذیتیں قومی آزادی کے اپنے عظیم مشن کی تکمیل اور کئی بار اٹھائے ہوئے اپنے حلف کی تعمیل کے سلسلے میں برداشت کر رہا ہوں، جو سکون قلب حاصل ہوتا تھا اس کی وضاحت کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ یہ سکون ایک ناقابل بیان اور ناقابل تصور روحانی لذت کا حامل تھا۔ اس سکون کی روح پرور لذت کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو عظیم مقاصد کے حصول کی جدوجہد کے دوران ملنے والی ذہنی اور جسمانی اذیتوں کو اپنے فرائض کی ادائیگی کا حصہ سمجھ کر خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوں۔

ملٹری کوارٹر گارڈ گلگت میں چار ماہ

راولپنڈی سے ہوائی جہاز میں گلگت پہنچانے کے بعد مجھے سول جیل کی بجائے گلگت سکاؤٹس کے کوارٹر گارڈ (فوجی حوالات) میں رکھا گیا۔ جہاں میں چار ماہ رہا۔ اس دوران مجرم میرے بھتیجے قدم خان کے کسی کو مجھ سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیٹرن کوارٹر گارڈ سے تقریباً ایک فرلانگ دور دریا کے کنارے تھی۔ چنانچہ جب مجھے رفع حاجت کے لئے باہر لے جایا جاتا تو چھ سپاہی بندوقوں پر سنگین چڑھائے (دو دو بائیں دائیں اور ایک ایک آگے پیچھے) میرے ساتھ ہوتے۔ رات کو جلانے کے لئے ابتدا میں لائٹیں بھی نہیں تھیں۔ کوئی ایک ماہ بعد لائٹیں دی گئی۔ کھانا شروع میں گلگت سکاؤٹس کے سپاہیوں کے لنگر سے آتا تھا بعد میں جو نیئر کمیشنڈ آفیسرز (JCO's) کے میس سے آنے لگا۔ مجھے رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ کچھ مقامی بے سی اوز نے ایک وفد کی صورت میں کمانڈنٹ سے ملاقات کر کے استدعا کی تھی کہ مجھے کھانا بے سی اوز میس سے بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ گلگت سکاؤٹس کے بے سی اوز خاص کر نائب صوبیدار عبدالرحمن اور صوبیدار میجر شریف اللہ بیگ نے میرا بہت خیال رکھا۔ اکثر سپاہیوں خاص کر ہنگلو حاصل مراد آف گوجال ہنزہ نے میری بڑی خدمت کی۔ میری کوٹھری کے ساتھ دن رات بارہ سپاہیوں کی گارد ہوتی تھی جو ہر تین گھنٹے کے بعد بدلتی تھی۔ نومبر کی ابتداء سے مجھے ہر روز ایک گھنٹے کے لئے باہر دھوپ میں بیٹھنے کی بھی اجازت دی گئی اور دسمبر سے کمرے میں جلانے کے لئے لکڑی بھی ملنے لگی۔

میری کوارٹر گارڈ کی اسیری کے دوران ہی 1971ء کی پاک بھارت جنگ چھڑ گئی۔ کچھ دنوں

کے بعد گلگت پر بھارتی فضائیہ کے حملے کا خطرہ محسوس کیا گیا تو سکاؤٹس نے میرے لئے کوارٹر گارڈ کے سامنے ہی ایک بکر (مورچہ) بنایا اور کئی دن تک روزانہ کئی کئی گھنٹے مجھے وہاں رکھا جاتا رہا۔ اس دوران گلگت سکاؤٹس کی کئی کمپنیوں کو محاذ جنگ پر بھیجا گیا۔ دسمبر کی اس غضب کی سردی میں ان کو عام وردی (قبض شلوار جرسی) میں انتہائی اونچے پہاڑوں پر واقع محاذوں پر بھیجا گیا۔ میں کوارٹر گارڈ سے ان کی روانگی کا منظر دیکھ کر ایک طرف ان کی بہادری اور جذبہ قربانی کی داد دیتا اور دوسری طرف حکومت کی اس مجرمانہ غفلت پر حیرت ہوتی جو ان جوانوں کو بہترین گرم وردی اور دوسری آسائشوں کے علاوہ جدید ترین اسلحہ سے لیس بھارتی افواج سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک رائفل لئے اور قبض شلوار میں ملبوس اس حالت میں بھیج رہی تھی۔ اس حالت میں بھی ان جوانوں نے بھارتیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بھارتیوں کا سارے گلگت بلتستان پر قبضہ کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ چند سال بعد گلگت سکاؤٹس، ناردرن سکاؤٹس اور قراقرم سکاؤٹس کو ملا کر ناردرن لائٹ انفنٹری (این ایل آئی) بنائی گئی جس کے نتیجے میں انہیں کچھ آسائشیں میسر آئیں گو ان فرائض کی نوعیت اور علاقے کی جغرافیائی اہمیت کے لحاظ سے یہ آسائشیں بھی ناکافی ہیں۔

16 دسمبر 1971ء کو پاکستان آرمی نے مشرقی پاکستان میں بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ اس دن میں نہ کھانا کھا سکا نہ سو سکا اور رات بھر آنسو بہاتا رہا۔

گلگت جیل میں مزید دو ماہ

گلگت سکاؤٹس کوارٹر گارڈ میں تقریباً چار ماہ گزارنے کے بعد اواخر دسمبر میں مجھے گلگت جیل منتقل کیا گیا۔ جیل میں داخلے کے بعد ہی مجھے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل (جو میر آف نگر کے چچا تھے) نے کہا کہ انہوں نے میرے لئے زنان خانے کا کمرہ رکھا ہے۔ جہاں بخاری بھی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہاں اس وقت کچھ قیدی ہیں جو باہر والان میں رہیں گے۔ میں زنان خانے پہنچا تو دیکھا کہ کمرے میں نگر سٹیٹ کے وہ لوگ ہیں جنہیں میر آف نگر کے خلاف بغاوت کے الزام میں قید کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر 80 سال سے زیادہ عمر کے تھے۔ دراصل ڈپٹی صاحب مجھ پر احسان جتانے کے علاوہ میرے ذریعہ نگر کے ان عمر رسیدہ لوگوں کو اس گرم کوٹھری سے نکلوانا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں بخاری کے ارد گرد بیٹھے دیکھا تو سوچا کہ ان بزرگوں کو یہاں سے باہر سردی میں پھینک کر خود یہاں گرم کمرے میں رہنا انتہائی بے ضمیری ہوگی۔ چنانچہ میں نے اپنا سامان باہر والان میں رکھا اور دو ماہ وہاں ہی اس غضب کی سردی میں رہا۔ نگر والے بزرگ مجھے

دعائیں دیتے رہے۔

غالباً جنوری کے اواخر یا فروری کے اوائل میں مسٹر نصر من اللہ ریڈیڈنٹ بکر گلگت آئے تو میں نے انہیں خط لکھا کہ مجھے بتایا جائے کہ مجھے کس جرم میں قید رکھا گیا ہے کیونکہ گزشتہ پانچ ماہ سے مجھے کسی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا ہے نہ ہی مجھے کوئی سزا سنائی گئی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ میرے شاہی قلعہ لاہور جانے کے بعد تمام سیاسی قیدی ایک ایک کر کے ضمانتوں پر رہا ہو گئے تھے۔ کچھ نے تو حکام سے تحریری معافی بھی مانگی تھی۔ آخر میں شیر دلی پونیالی اور محمد علی انجینئر رہ گئے تھے جنہوں نے مشروط رہائی سے انکار کیا تھا۔ میری گلگت جیل منتقلی سے کچھ دن پہلے انہیں بھی غالباً غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا تھا اور اسی دوران میرے سمیت تمام کے خلاف کیس واپس لئے گئے تھے اس طرح گلگت کی وہ عوامی تحریک فوری طور پر علاقے کو بغیر کوئی فائدہ پہنچائے ختم ہو گئی البتہ حکام عوام سے برتاؤ کے سلسلے میں کچھ محتاط ضرور ہو گئے۔ اسی دوران ہری پور جیل والوں (جوہر علی، صفی اللہ بیگ، عبدالحمید آف مناوڑ، حیدر، صوبیدار ایوب اور عبدالرحیم وغیرہ) کو بھی رہا کر دیا گیا۔ میں نے جیل سے جوہر علی اور وکلاء کو خط لکھے جن میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل کے بارے میں کچھ تجاویز پیش کیں۔ لیکن کسی کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں آیا۔

ایک دن میں زنا نہ خانے کے والان میں لیٹا ہوا تھا کی ریڈیڈنٹ نصر من اللہ وہاں پہنچا۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد کہنے لگا کہ اسے میرا خط ملا ہے اور اس نے میرے بارے میں مرکزی حکومت سے احکامات طلب کئے ہیں کیونکہ ریکارڈ میں میرے خلاف کوئی کیس نہیں۔ مجھے وزارت امور کشمیر کے کسی افسر کی طرف سے ٹیلی فون پر ملنے والی ایک ہدایت کے تحت جیل میں رکھا گیا ہے۔ (در اصل وزارت امور کشمیر والے اور بھارتی جہاز گنگا کے سلسلے میں عدالت میں چلنے والے کیس میں استغاثہ کے افسر چاہتے تھے کہ کیس کے دوران میں جیل میں ہی رہوں تاکہ صفائی کے گواہ کی حیثیت سے یا کسی اور طریقے سے میں اپنے ملزم دوستوں مقبول بٹ وغیرہ کی کوئی مدد نہ کر سکوں) نصر من اللہ نے مجھے بتایا کہ جو نہی اسلام آباد سے جواب آئے گا میں آپ کو مطلع کروں گا۔ اس نے جیل کے حکام کو یہ ہدایت بھی دی کہ مجھے سنٹرل لاہوری جا کر وہاں سے کتابیں لانے کی بھی سہولت دی جائے چنانچہ دوسرے دن میں لاہوری جا کر کچھ کتابیں لے آیا۔

ستوط مشرقی پاکستان کے بعد یحییٰ خان نے اقتدار پاکستان پیپلز پارٹی کے سربراہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے حوالہ کر دیا اور بھٹو صاحب نے مرکز میں اپنی حکومت بنالی۔ پیپلز پارٹی کے کچھ اہم لیڈروں سے میرے ذاتی مراسم تھے۔ جن میں سے معراج محمد خان مرکز میں وزیر مملکت بن گئے تھے۔ جب انہیں گلگت کے فضل الرحمن، خلیل الرحمن، متولی خان اور حشمت اللہ وغیرہ کی زبانی

معلوم ہوا کہ میں ابھی قید ہوں تو انہوں نے وزارت امور کشمیر سے وضاحت طلب کی۔ وزارت انہیں مطمئن نہ کر سکی تو معراج محمد خان نے کہا کہ مجھے فوراً رہا کیا جائے چنانچہ 24 فروری 1972ء کو ریڈیڈنٹ نصر امن اللہ کو میری غیر مشروط رہائی کے احکامات ملے اور انہوں نے فوراً ہی جیل حکام کو میری رہائی کا حکم دے دیا اور مجھے اسی شام رہا کیا گیا۔ میری رہائی کی خبر سن کر ہنزہ کے غلام رسول سمیت کچھ دوست جیپیں لے کر جیل پہنچے اور مجھے شہر لے آئے۔ میرے دوستوں مقبول بٹ وغیرہ پر لاہور میں مقدمہ چل رہا تھا چنانچہ میں استور جا کر والدہ اور دوسرے بزرگوں اور عزیزوں سے ملاقات کئے بغیر ہی دوسرے دن گلگت سے لاہور آگیا اور اپنے دوستوں کی مدد میں مصروف ہو گیا۔

گلگت جیل میں مجموعی طور پر نو ماہ سے زیادہ کی اسیری کے دوران کچھ لوگوں نے میری بڑی خدمت کی۔ ابتدا میں عام قیدی غلام محمد اور اس کے بھائی غلام سرور نے بڑی خدمت کی۔ ان سے بھی زیادہ ان کے والد کثوث گلگت کے محمد رفیق مرحوم نے کی جو روزانہ میرے لئے گھر سے دودھ اور بعد میں کھانا بھی لے آتے تھے۔ ان کی اہلیہ بھی ایک عظیم خاتون ہیں۔ ٹھیکیدار شکور محمد نے بھی میرا بڑا خیال رکھا۔ جنوری 1971ء کے واقعات کے بعد میرا سب سے زیادہ خیال ہنزہ کے غلام رسول نے رکھا وہ سگے چھوٹے بھائی کی طرح میری دیکھ بھال کرتا رہا۔ اس کے علاوہ مرتضیٰ آباد شاپ گلگت کے مالک ذوالفقار علی نے بھی میرا بڑا خیال رکھا۔ دوسرے قیدی بھی میرا بڑا خیال رکھتے تھے۔ میرے کپڑے تک دھوتے۔ وارڈوں میں سے سب سے زیادہ خدمت علی نو مسلم نے کی۔ ہیڈ وارڈر غلام عباس اسٹنٹ سپرائنڈنٹ غلام قادر بھی میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرتے تھے ڈپٹی سپرائنڈنٹ راجہ مظفر الدین مرحوم بھی میرا پورا احترام کرتے تھے اور اپنے مخصوص نگری لہجے میں مجھے کاکو (بھائی صاحب) کہہ کر پکارتے تھے۔ اکثر قیدی اپنے ملاقاتیوں کے ذریعہ میرے لئے گوشت، گھی، راجماش اور میوے وغیرہ منگاتے تھے۔ خود مجھ سے ملنے آنے والے بھی اشیاء خوردنی لاتے الغرض بجز ان ستائیس دنوں کے جب ہمیں ہتھکڑیوں میں بند رکھا جاتا رہا میں نے مجموعی طور پر گلگت جیل میں اچھے دن گزارے۔ وارڈر اور قیدی سب عزت کرتے تھے۔ قیدیوں کی طرف سے احترام کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک دن ڈپٹی سپرائنڈنٹ نے مجھ سے کہا کہ ندی کا پانی گرم ہے میں چاہتا ہوں کہ پینے کے پانی کے لئے جیل کے اندر کنواں کھودا جائے تاکہ ٹھنڈا پانی ملے۔ گزشتہ مہال بھی کھودا تھا جو سردیوں میں مٹی سے بھر گیا ہے۔ قیدی میرا نہیں مانتے۔ آپ انہیں کہیں شاید مان جائیں۔ یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔ میں نے سوچا ممکن ہے قیدی میرا کہنا بھی نہ مانیں اس لئے میں قیدیوں سے کہنے کے بجائے سنور سے ایک گینتی بیلچہ نکال کر خود کنواں کھودنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد قیدی جمع ہو گئے۔ اور کہنے لگے کیا ہم سب مر گئے ہیں کہ آپ خود کنواں کھود رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے گینتی

چھین لی اور دو دن میں کنواں تیار کیا۔ الغرض گلگت جیل میں نو ماہ کی اسیری کے دوران مجھے مجموعی طور پر جیل حکام اور قیدیوں کی طرف سے پورا احترام ملا جس کے لئے میں ان سب کا مشکور ہوں۔

جنوری 1971ء گلگت کی عوامی تحریک کا فوری فائدہ تو یہ ہوا تھا کہ اس نے گلگت کے معاشرے کی چار انتہائی خطرناک بیماریوں (یعنی فرقہ وارانہ، نسلی اور علاقائی تعصبات اور مراعات یافتہ ایک ٹولے کی طرف سے حکام کی بے جا چالپوسی) میں سے اولڈ کرتین کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور عوام کو پوری طرح متحدہ کر دیا تھا لیکن چوتھی بیماری بدستور قائم رہی تھی البتہ تحریک کے دوران چالپوسوں کا یہ ٹولہ جنہیں عوام سرکاری پیچھے کے نام سے پکارتے تھے، بھی خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ دراصل یہ چاروں بیماریاں حکام کی طرف سے، لڑاؤ اور حکومت کرو، کی پالیسی پر مستقلاً عمل پیرا ہونے اور ان علاقوں کے عوام کو آئینی حقوق اور سیاسی سرگرمیوں سے محروم رکھنے کے نتیجے میں پیدا ہو گئی تھیں۔ میں نے اور وکلاء نے پوری کوشش کی کہ یہ عوامی اتحاد قائم رہے لیکن حکام ہم سے کہیں زیادہ ہوشیار نکلے، انہوں نے پہلے وکلاء کو گلگت جیل سے گوپس قلعے منتقل کر دیا اور اس طرح مجھ سے اور عوام سے ان کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد مجھے شاہی قلعہ لاہور لے جایا گیا۔ چنانچہ عوام کو کہیں سے رہبری نہیں ملی اور اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر حکام نے عوامی اتحاد کو ختم دیا۔ ادھر وکلاء حضرات بھی حالات کا صحیح تجزیہ نہ کر سکے اور ایک ایک کر کے جیل سے رہائی حاصل کرتے رہے۔ چنانچہ جس تیزی سے عوام میں اتحاد پیدا ہو گیا تھا تقریباً اسی تیزی سے ختم ہو گیا اور نتیجتاً ”علاقہ پھر سے پرانی بیماریوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ یہی نہیں بلکہ یہ بیماریاں شدید سے شدید تر ہوتی گئیں اور اگر وہاں کے عوام کو ان کے آئینی حقوق اور سیاسی آزادی سے اسی طرح محروم رکھا گیا تو بعید نہیں کہ مستقبل قریب میں کوئی بڑا سانحہ پیش آئے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کی ذمہ داری بھی حکام اور ان نام نہاد کوتاہ نظریڈروں پر عائد ہوگی جو ذاتی مفاد کے لئے عوام کے فرقہ وارانہ جذبات کو بڑھکاتے رہتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے حوالات میں ایک گھنٹہ

1980ء میں اپنے قیام نیویارک کے دوران مجھے اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کے ایک ممنوعہ علاقے میں جانے کی پاداش میں ایک گھنٹہ اقوام متحدہ کے حوالات میں گزارنا پڑا۔ تفصیلات ”اقوام متحدہ میں میری سرگرمیاں“ کے باب میں درج ہیں۔

برمنگھم پولیس سٹیشن میں 72 گھنٹے

3 فروری 1984ء کی رات کو برمنگھم (برطانیہ) میں بھارت کے اسٹنٹ ہائی کمشنر راوندرہا مہاترے کو ”کشمیر لبریشن آرمی“ نام کی ایک تنظیم نے اغوا کر لیا۔ میری رہائش ان دنوں لندن کے نزدیک ایک شریوٹن میں تھی، پاکستان سے ہاشم قریشی اور سعودی عرب سے افضل طاہر بھی آئے تھے اور میرے ہاں قیام پذیر تھے 5 فروری کو مجھے اور ہاشم قریشی کو پولیس گرفتار کر کے لیوٹن پولیس اسٹیشن لے گئی۔ جہاں ہم دونوں سے الگ الگ کمروں میں دو گھنٹے تک بیان لئے گئے۔ اس اثناء میں پولیس نے میرے گھر (جس کے نیچے والے چار کمروں میں لبریشن فرنٹ کا مرکزی دفتر تھا) کی پوری تلاشی لی اور سارا ریکارڈ ضبط کر کے لیوٹن اور بعد میں برمنگھم پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا۔ چار بجے کے قریب ہمیں کہا گیا کہ برمنگھم میں قائم مہاترے کے اغوا کی تفتیشی ٹیم کا سربراہ ہم سے بات کرنا چاہتا ہے اس لئے ہمیں برمنگھم لے جایا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہمیں دو الگ الگ کاروں میں بٹھا کر اور بھاری گارڈوں میں پولیس برمنگھم روانہ ہو گئی۔

شام کو ہم برمنگھم پہنچے اور مجھے سنٹرل پولیس لائنز جہاں مہاترے اغوا کیس کی تفتیشی ٹیم نے اپنا مرکز قائم کیا تھا، کے ایک کمرے میں رکھا گیا اور ایک پولیس آفیسر نے مجھ سے پوچھ گچھ کی۔ اس کے بعد وہ باہر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آ کر کہنے لگا مسٹر خان آپ کو ہم جلدی ہی چھوڑ رہے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ پھر باہر چلا گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد واپس آیا اور انتہائی ترش لہجے میں کہنے لگا۔ مسٹر خان ہمیں ابھی ابھی آپ کے ریکارڈ سے ایسی دستاویزات ملی ہیں جن سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مہاترے کے اغوا کی پوری منصوبہ بندی آپ نے کی ہے۔ اس لئے ہم آپ کو باقاعدہ گرفتار کر رہے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ مجھے اندر دفتر میں لے گیا۔ جہاں میرے فوٹو اور انگوٹھے کے نشانات وغیرہ لینے کے بعد مجھے ایک سیل (Cell) میں بند کر دیا گیا۔ رات گیارہ بجے کے قریب دوڑ ایک سیل سے ہاشم قریشی کی آواز سنائی دی جو اونچی آواز اور دیسی انگریزی میں کسی پولیس والے سے بات کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ہاشم کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔

دوسری صبح کو پولیس والے آئے اور انہوں نے مجھے ایک لمبا سا کوٹ پہننے کو دیا اور میرے سارے کپڑے کیمیائی تجزیے کے لئے لے گئے (یہ کپڑے مجھے چار پانچ ماہ بعد واپس ملے) شام کو ایک بار میں نے سگریٹ پینے کے لئے ایک پولیس والے سے ماچس مانگی تو اس نے فحش سی لہجے میں گالی دیتے ہوئے کہا کہ تم تیس سال تک جیل میں سڑو گے۔

7 فروری کی شام کو مجھے صرف لمبا کوٹ پہنے اور ننگے پاؤں ایک دفتر میں لے جایا گیا جہاں بیٹھے دو پولیس افسروں نے مجھے بتایا کہ مہاترے کو کشمیر لبریشن آرمی والوں نے قتل کیا ہے

اور اس کی لاش یسٹر کے پاس ملی ہے یہ بات کہہ کر دونوں آفسر ہنگامی باندھ کر میرے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے وہ تمام سوال ایک بار پھر دہرائے جو مجھ سے لیوٹن اور بریگم میں پوچھے گئے تھے۔ میں نے بھی وہی جواب دہرائے۔ اس کے بعد انہوں نے مختلف نفسیاتی ہتھکنڈے استعمال کر کے مجھ سے ہاشم کے خلاف باتیں اگلوانے کی ناکام کوشش کی۔

دوسری صبح کو تقریباً نو بجے مجھے ملازموں سے بیان لینے کے کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں دو افسروں نے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کی۔ انہوں نے ایک فوٹو مجھے تھماتے ہوئے مجھ سے پوچھا کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں میں نے فوٹو کو غور سے دیکھا اور جواب دیا میں اس شخص کو نہیں جانتا۔ کہنے لگے آپ جھوٹ بولتے ہیں آپ اسے جانتے ہیں اور اس بارے میں ہمارے پاس ثبوت ہے میں نے کہا یہ کون ہے کہنے لگے بھارتی سفارت کار مہاترے جسے آپ نے اغوا اور پھر قتل کروایا۔ میں نے کہا میں نے نہ مہاترے کو کبھی دیکھا ہے نہ اغوا کروایا ہے اور نہ قتل کروایا ہے۔ اس پر انہوں نے بریف کیس سے میری ڈائری نکال کر مجھے دکھائی اور مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ ڈائری آپ کی ہے میں نے کہا ہاں یہ میری ڈائری ہے۔ پھر کہنے لگے کہ یہ ڈائری ثابت کرنی ہے کہ تم مہاترے کو جانتے تھے اور تم نے ہی اس کے اغوا کا منصوبہ بنایا تھا اس لئے کہ اس ڈائری میں دو جگہ تمہاری تحریر میں مہاترے کا نام لکھا ہے یہ کہہ کر انہوں نے مجھے وہ صفحہ دکھایا جہاں میں نے دو جگہ مہاترے لکھا تھا میں نے کہا میں نے مہاترے کا نام اس کے اغوا کی خبر آنے کے بعد لکھا ہے۔ خبر آنے کے بعد میں نے بھارتی صحافیوں سے فون پر اغوا ہونے والے سفارت کار کا نام پوچھا تھا۔ دونوں نے مہاترے کے دو مختلف جے (Spelling) بتائے اور میں نے دونوں اپنے سامنے رکھی اس ڈائری پر نوٹ کئے کیونکہ میں اس مسئلے کو حل کرنے میں مصروف تھا جس کا پورا علم برطانیہ کے ذرائع ابلاغ خاص کر بھارتی صحافیوں کو ہے جن کے ذریعہ میں بھارتی ہائی کمیشن سے رابطہ پیدا کرنے کی ناکام کوششیں کرتا رہا۔ اس کے بعد میں نے ڈائری ہی سے دونوں صحافیوں کے فون نمبر پولیس آفسر کو دے دیئے اور اسے کہا کہ وہ ان سے میرے بیان کے بارے میں پوچھ سکتے ہیں۔ سینئر افسر دونوں فون نمبر لے کر باہر چلا گیا اور آدھ گھنٹے کے بعد واپس آیا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں بھارتی صحافیوں نے میرے بیان کی تصدیق کی ہے۔

اس کے بعد اس نے مجھے اسلحہ کی ایک فہرست دکھائی اور کہنے لگا یہ فہرست آپ کے ہاں سے ملی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اس ملک میں باہر سے جدید اسلحہ اسمگل کرتے رہے ہیں۔ میں نے کہا اس فہرست کے ساتھ ایک کورنگ لیٹر بھی تھا جو آپ مجھے نہیں دکھا رہے ہیں اس کورنگ لیٹر میں اس فہرست کی پوری وضاحت ہے اس کے علاوہ یہ فہرست میں

نے نہیں بنائی کسی نے مجھے بھیجی ہے۔ میں نے فرست سے متعلق معاملات کی وضاحت بھی کی۔ اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ مجھے اپنے سیل میں بند کر دیا گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے خلاف کیس رجسٹر کرنے کے لئے پولیس کو مطلوبہ مواد نہیں مل رہا۔

پونے ایک بجے کے قریب ایک پولیس آفیسر آگیا اور مجھے سیل سے باہر لے آیا۔ باہر ہاشم بھی کھڑا تھا۔ ہمیں کہا گیا کہ ہم اب آزاد ہیں۔ ہم نے کہا ہمیں ہمارے کپڑے دیئے جائیں ہم اس عجیب حلقے میں اور ننگے پیر اس وقت کہاں جائیں ہماری رہائش ایک سو میل دور لیوٹن میں ہے چنانچہ ہمیں اسی حلقے میں کاروں میں بٹھا کر لیوٹن پہنچایا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لبریشن فرنٹ کے سیکرٹری جنرل زبیر الحق انصاری نے ہائی کورٹ میں ہمارے بارے میں میس کارپس (Habeas Corpus) کی رٹ دائر کی تھی اور ہائی کورٹ نے پولیس کو حکم دیا تھا کہ اگر امان اللہ اور ہاشم کے خلاف کیس رجسٹر نہیں کیا گیا ہے تو انہیں اس دن ایک بجے تک رہا کیا جائے کیونکہ ایک بجے ان کو زیر حراست 72 گھنٹے ہو جائیں گے اور قانون کسی کو اس کے خلاف کیس رجسٹر کئے بغیر 72 گھنٹے سے زیادہ مدت کے لئے زیر حراست رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس طرح ہماری یہ مختصر سی اسیری ختم ہو گئی۔

برطانیہ کے مختلف جیلوں میں پندرہ ماہ دس دن

ہر سال ستمبر کے دوسرے منگل سے نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہوتا ہے۔ میں اداکل ستمبر 1985ء سے ہی نیویارک جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا اور وہاں تقسیم کرنے کے لئے مسئلہ کشمیر پر ایک نئے کتابچے کو آخری شکل دینے کے لئے 4 ستمبر کی رات دو ڈھائی بجے تک اپنے دفتر میں رہا۔ ڈھائی بجے رات تھک ہار کر اوپر چلا گیا اور بسترے پر لیٹ گیا۔ میں گہری نیند میں تھا کہ شور نے مجھے جگا دیا اور مجھے محسوس ہوا جیسے زلزلہ آیا ہے۔ سارا مکان ہلتا معلوم ہو رہا تھا میں کھڑا ہو گیا تاکہ دوسرے کمرے میں جا کر دیکھوں کہ میری بیوی، بچی اور دوسری عزیزہ خیریت سے ہیں۔ اندھیرے میں ہی دروازے کی طرف جانے لگا تو باہر سیڑھیوں پر سے باتیں سنائی دیں۔ میں سمجھا گھر پر ڈاکہ پڑا ہے یا نسل پرست انگریز گھس آئے ہیں۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا باہر سیڑھیوں پر درجن بھر پولیس والے کھڑے ہیں۔ جوئی دروازہ کھلا ایک پولیس والے نے بندوق سے میرے سینے کا نشانہ لیتے ہوئے مجھ سے پوچھا امان اللہ خان کہاں ہے۔ میں نے کہا کیا بات ہے۔ اس نے انتہائی ترش لہجے میں پھر پوچھا امان اللہ خان کہاں ہے۔ میں نے کہا کیا بات ہے امان اللہ میں ہی ہوں۔ اس پر فوراً ہی تین چار پولیس والے میری طرف لپکے اور مجھے نیچے گرا کر میرے جیبوں کی تلاشی لینے لگے۔ دوسرے بھی اندر

گھس آئے اور کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ یہ سب پولیس والے پوری طرح مسلح اور بلٹ پروف جیکٹ (Bullet Proof Jackets) پہنے ہوئے تھے۔ ایک کتا بھی ساتھ تھا۔ تلاشی کے بعد میں نے انچارج سے کہا کہ میں دوسرے کمرے میں جا کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ میری بیوی بچے خیریت سے ہیں۔ جواب ملا وہ خیریت سے ہیں لیکن آپ وہاں نہیں جاسکتے۔ اس نے مجھے نیچے ڈرائنگ روم میں چلنے کے لئے کہا۔ میں نے جوتا پہننا چاہا تو اجازت نہیں ملی۔ میں ننگے پاؤں نیچے کی طرف چل دیا تو پتہ چلا کہ سیڑھیوں پر شیشوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ پولیس بڑے دروازے کا شیشہ توڑ کر اندر گھس آئی تھی۔ بہر حال میں نیچے جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ چھاپہ مار ٹیم کا سربراہ بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا اور کچھ سپاہی بندوقیں میری طرف تان کر سامنے کھڑے رہے باقی سپاہی جو تعداد میں چالیس کے قریب تھے اور کتا مکان اور پیچھے باغیچے کی تلاشی میں مصروف رہے۔ مجھے یہ صورت حال دیکھ کر ایسا ہی وہ منظر یاد آیا جب 1947ء میں مقبوضہ کشمیر میں ہندواڑہ کے نزدیک موضع براری پورہ میں بھارتی فوج صمدوانی صاحب کے گھر میں گھس آئی تھی جہاں طالب علم کی حیثیت سے میرا بھی قیام تھا۔

صبح ہوئی تو میں نے دیکھا کہ سارے علاقے کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہے اور ساتھ والی سڑک پر ٹریفک بھی بند کر دی گئی ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ پولیس نے ساتھ والی مسجد کے امام مولانا عبدالعزیز چشتی کو نماز پڑھانے کے لئے مسجد بھی جانے نہیں دیا تھا۔ بہر حال چار گھنٹے تک مکان کی تلاشی ہوتی رہی اور پولیس نے لبریشن فرنٹ کا سارا ریکارڈ معہ ٹائپ رائٹر اپنے قبضے میں لے لیا۔ (بعد میں پولیس نے میرے وکیل کو بتایا کہ یہ ریکارڈ چھ ہزار دستاویزات پر مشتمل تھا جن کی چھان بین پر پولیس کو سات مہینے صرف کرنے پڑے) نو بجے مجھے کہا گیا کہ پولیس مجھے پولیس سٹیشن لے جا رہی ہے۔ میں نے بچوں سے ملنا چاہا چنانچہ مجھے انچارج کی موجودگی میں اور صرف انگریزی میں بات کرنے کی شرط پر اپنی بیوی اور بچی سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ میں اوپر گیا تو میری بیوی، بیٹی اور دوسری عزیزہ کے پاس ایک لیڈی پولیس آفیسر بیٹھی تھی۔

مجھے بیوی اور بچی سے چند باتیں کرنے کی اجازت ملی اور اس کے بعد نیچے لایا گیا اور باہر نکال کر کار میں بٹھایا گیا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میں نے اپنے گھر اور دفتر (کشمیر ہاؤس) پر ایک نظر ڈالی۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اپنے اس مکان کو آخری بار دیکھ رہا ہوں۔ گھر میں سرسری سوال و جواب کے دوران انچارج نے مجھے کہا تھا کہ ہماری اطلاع کے مطابق آپ کے مکان میں غیر قانونی طور پر اسلحہ رکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا میرے گھر میں یا دفتر میں کوئی اسلحہ نہیں۔ دیکھ کر اطمینان کر لو۔

پولیس سٹیشن پر دن بھر مجھ سے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ میں

بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی جو کچھ مدت بعد برطانیہ کا دورہ کرنے والے تھے، کو قتل کرنے یا کرانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ میں الزام کی پوری شدت سے تردید کرتا رہا۔ اس دوران میرا وکیل مسٹر جیف سلومن (Jeff Solomon) جو میرا دوست بھی تھا مجھ سے ملنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اسے اس کی اجازت نہیں ملی کیونکہ بقول پولیس یہ کیس قومی سلامتی سے متعلق تھا۔ عام حالات میں پولیس ملزم کے وکیل کی غیر موجودگی میں ملزم سے بیان بھی نہیں لے سکتی ہے۔ چھ تاریخ کی دوپہر کو وکیل مجھ سے ملاقات کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے مجھے بتایا کہ پولیس خاصی پریشان ہے اس لئے کہ اسے تمہارے خلاف کوئی مواد نہیں مل رہا۔ معلوم ہوتا ہے پولیس پر اوپر سے خاصا دباؤ ہے کہ کسی طرح امان اللہ کے خلاف کیس بناؤ۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پولیس نے تمہاری اور تمہارے دوسرے دوستوں کی گرفتاری کو وسیع کوریج دی ہے اور یہ بھی کہ تمہاری بیوی بچی کو تم سے ملاقات کی اجازت ملی ہے۔ شام کو میرا وکیل پھر آیا اور مجھے اطلاع دی کہ میرے خلاف غیر قانونی طور پر آتش گیر کیمیائی مواد گھر میں رکھنے کے الزام میں کیس رجسٹر کیا گیا ہے اور صبح عدالت میں پیش کر کے میرا ریمانڈ حاصل کیا جائے گا۔ رات آٹھ بجے کے قریب میری بیوی اور بچی مجھ سے ملنے آئیں اور اخبارات بھی ساتھ لائیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے خلاف کیس رجسٹر ہوا ہے اور اب مجھے کچھ مدت تک جیل میں رہنا ہو گا ان کے جانے کے بعد میں نے حوالات میں جا کر اخبار پڑھے۔ برطانیہ کے ہر قومی اخبار نے ہماری ڈرامائی گرفتاری کی خبر نمایاں طور پر دی تھی۔ حکومت کے حامی اخبار ڈیلی ٹیلی گراف نے صفحہ اول پر دی ہوئی خبر میں سرکاری ذرائع کے حوالے سے لکھا تھا کہ لبریشن فرنٹ والوں کو بھارتی حکومت کے ایما پر گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے علاوہ برمنگھم سے چوہدری عبدالجید اس کا بیٹا جاوید اور معصوم انصاری اور بلیک برن سے چوہدری محمد صدیق کو بھی گرفتار کیا ہے لندن کے اردو روزناموں ”جنگ“ اور ”وطن“ نے ہماری گرفتاری کی خبر شہ سرخیوں میں دی تھی۔

7 ستمبر کی صبح کو مجھے پولیس سٹیشن سے زیر زمین راستے سے ساتھ والی عدالت میں لے جایا گیا۔ عدالت کشمیریوں سے کچھ کھچ بھری ہوئی تھی بعد میں پتہ چلا کہ اندر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد باہر ہی رہی۔ عدالت میں ”وطن“ لندن کے ایڈیٹر علی کیانی معہ فوٹو گرافر مسٹر فاروقی بھی موجود تھے۔

دس پندرہ منٹ کی رسمی سی کارروائی کے بعد پولیس نے میرا ریمانڈ حاصل کیا اور میں خود مختار کشمیر زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے اور ہاتھ سے (V) کا نشان بناتے ہوئے باہر نکل آیا جہاں سے مجھے زیر زمین راستے سے ہی واپس تھانے لے جایا گیا۔

تھانے میں پھر سے رسمی سی پوچھ گچھ ہوئی اس کے بعد مجھے کہا گیا کہ مجھے بیڈ فورڈ جیل

لے جایا جا رہا ہے۔ سہ پہر کو مجھے ایک کار میں بٹھا کر اور مزید دو پولیس کاروں کی گارد میں تقریباً تیس کلو میٹر دور بیڈ فورڈ جیل پہنچایا گیا۔ جیل والوں کو شاید پہلے ہی اطلاع دی گئی تھی کہ ایک خطرناک قیدی آ رہا ہے اس لئے جیل کا سربراہ (جسے گورنر کہا جاتا ہے) بھی وہاں استقبالیہ کے پاس ہی کھڑا تھا۔ پولیس گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک شکل سے آرش نظر آ رہا تھا۔ جس نے دوران سفر مجھ سے کچھ ہمدردانہ سے لہجے میں باتیں کی تھیں۔ استقبالیہ پر متعین آفیسر نے مجھ سے دوسرے کوائف پوچھنے کے بعد میری قومیت پوچھی۔ میں نے کہا کشمیری۔ اس نے کہا کشمیری کوئی قوم نہیں ہے۔ تم یا پاکستانی ہو سکتے ہو یا بھارتی۔ میں نے کہا میں نہ پاکستانی ہوں نہ ہندوستانی میں صرف کشمیری ہوں۔ اس پر ہماری بحث خاصی طول پکڑ گئی تو میرے ساتھ میری ہتھکڑی پکڑے ہوئے کھڑے اس آرش پولیس والے نے استقبالیہ آفیسر سے مخاطب ہو کر کہا آفیسر! آپ ضد کیوں کر رہے ہیں۔ مسٹر خان تو اپنا قومی تشخص منوانے کی کوششوں کی پاداش میں ہی یہاں جیل پہنچا ہے یہ کیسے تسلیم کرے گا کہ اس کا اپنا کوئی قومی تشخص نہیں یا وہ بھارتی یا پاکستانی ہے۔ اس پر جیل کے افسر نے مجھ سے پوچھا تمہارے پاس کس ملک کا پاسپورٹ ہے میں نے کہا پاکستانی۔ چنانچہ اس نے متعلقہ کالم میں پاکستانی پاسپورٹ ہولڈر کشمیری لکھ دیا۔ اس کانغذی کارروائی کے بعد مجھے اوپر لے جایا گیا جہاں کچھ اور کانغذی کارروائی کے بعد مجھے میرا جیل نمبر جو N 40837 تھا الاٹ کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ میں اپنی خط و کتابت میں یہ نمبر ضرور درج کروں (یہ نمبر مجھے 23 ستمبر 1986ء کو عدالت سے میری بریت تک الاٹ رہا) نمبر الاٹ کرنے کے بعد مجھے جیل کے کپڑے اور صابن تولیہ دے کر کہا گیا کہ میں غسل خانے میں جا کر نماؤں اور جیل کے کپڑے پہنوں۔ اس کے بعد مجھے لے جا کر ایک سیل میں ڈالا گیا سیل میں دیواروں پر بالکل تنگی عورتوں کی تصویریں اور الماری میں فحش رسالے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک وارڈر جسے وہاں پرنس آفیسر (Prison officer) کہتے ہیں کو بلا کر کہا کہ وہ ان تصویروں اور رسالوں کو وہاں سے لے جائے۔ وہ میری طرف حیرانگی سے دیکھنے لگا اور عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ تصویریں اور رسالے لے کر باہر چلا گیا۔ دراصل وہاں اس قسم کی چیزیں پاس رکھنا معیوب نہیں بلکہ ایسی چیزیں اپنے پاس رکھنے والوں کو زندہ دل کہا جاتا ہے۔

میری گرفتاری کی خبر مقامی ریڈیو سٹیشن سے کئی بار نشر ہوئی تھی اور جیل میں ہر قیدی کے پاس ریڈیو ہوتا ہے۔ کسی پرنس آفیسر نے کسی قیدی سے کہا کہ دہشت پسند خان یہاں اور اس سیل میں ہے چنانچہ کھانا کھانے کے بعد پیشاب وغیرہ کے لئے باہر نکلنے کے دوران میرے سیل کے سامنے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گئی اور مجھ پر طرح طرح کے تبصرے ہونے لگے۔ کسی نے کہا یہ تو دہشت پسند معلوم ہی نہیں ہوتا۔ کسی نے مجھے شاباش دیتے ہوئے (V) کا نشان بنایا۔ وغیرہ وغیرہ

دوسرے دن صبح ہی جیل کا پادری آیا۔ میرے ساتھ سرسری سی گپ شپ کے بعد کہنے لگا آپ ایک لکھے پڑھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں آپ سے اسلام کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا میں کوئی مذہبی عالم تو نہیں البتہ جو کچھ مجھے معلوم ہے مجھے آپ کو بتانے میں خوشی ہوگی۔ اس کے بعد میں نے اسے اسلام کی بنیادی تعلیمات، عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات میں یکسانیت والے پہلوؤں، اور اختلافات والے پہلوؤں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظریہ، واحدانیت، اسلام کے معاشی اور سماجی نظام اور اسلام کے نظریہ سزا و جزا وغیرہ کے بارے میں چیدہ چیدہ باتیں بتائیں۔ وہ غور سے سنتا رہا۔ آخر میں کہنے لگا میں جیل کے مولوی سے بھی کبھی اسلام کے بارے میں پوچھتا رہا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے اس کی معلومات انتہائی محدود ہیں۔ اس نے اسلام کی وضاحت اس طرح کبھی نہیں کی۔ میں نے کہا بد قسمتی سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین مسلسل ٹکراؤ رہا ہے۔ ایک زمانے میں اسلام انڈونیشیا سے مشرقی یورپ اور سپین تک چھایا ہوا تھا۔ اس کے بعد عیسائی غالب آگئے اور انہوں نے تقریباً پورے عالم اسلام پر قبضہ کر لیا اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں عیسائی حکمرانوں اور مذہبی لیڈروں نے اپنے عوام میں اسلام کو وحشیوں، قاتلوں، ظالموں اور احمقوں کے مذہب کے طور پر پیش کیا جس کا اثر مغرب میں اب بھی موجود ہے چنانچہ مغرب کا عام انسان آج بھی اسلام اور مسلمانوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ پادری نے میرے موقف سے اتفاق کیا اور پھر مل کر مزید تبادلہ خیال کرنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں پائے جانے والے اس غلط تاثر کو اپنے طرز عمل، کردار، اخلاق اور تبادلہ خیال کے ذریعہ ختم کرنے کی مقدور بھر کوشش کروں۔ چنانچہ اپنی پندرہ ماہ کی اسیری کے دوران میں نے اپنے اسلامی شخص کو برقرار رکھنے بلکہ نمایاں کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس طرز عمل سے مجھے سکون قلب ملنے کے علاوہ اپنی انفرادیت کا بھی احساس ہوا۔

میں نے گشت پر آئے ہوئے گورنر کو بتایا کہ میں مسلمان ہوں۔ سور کا گوشت اور اس کی چربی میں کچے ہوئے سالن نہیں کھاتا اس لئے میرے لئے یا تو باہر سے کھانا منگانے کی اجازت دی جائے یا جیل میں ہی الگ کھانا بنایا جائے۔ چنانچہ اس نے اسی وقت وارڈر سے کہا کہ خان کو خالی ابلی ہوئی سبزی اور ڈبل روٹی دی جائے۔ میں نے نماز پڑھنے کے لئے بھی کچھ سولتیں حاصل کیں حالانکہ میں جیل سے باہر باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھتا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جیل میں لکھنے پڑھنے کی بھی اجازت ہے چنانچہ میں نے دوسرے دن باہر سے کانڈ قلم منگوائے اور لکھنا شروع کیا۔

بیڈ فورڈ جیل میں میرا غالباً چوتھا دن تھا کہ ایک وارڈر نے آکر مجھے کہا کہ میں اپنا سامان

ساتھ لے کر باہر آؤں۔ وہ مجھے دفتر لے گیا جہاں مجھے بتایا گیا کہ مجھے ہیڈ فورڈ جیل سے باہر لے جایا جا رہا ہے۔ باہر تین پولیس گاڑیاں کھڑی تھیں چنانچہ وہ مجھے لے کر بڑی شاہراہ (M1) کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میں سمجھا شاید مجھے ملک بدر کرنے کے لئے ایئرپورٹ لے جایا جا رہا ہے۔ مجھے یہ خیال اس لئے آیا کہ لیوٹن پولیس سٹیشن پر پوچھ گچھ کے دوران ایک بار ایک افسر نے غیر رسمی طور پر مجھ سے پوچھا تھا کہ اگر تم پر مقدمہ چلانے کی بجائے تمہیں ملک بدر کیا جائے تو کیا تم اس پر راضی ہو جاؤ گے میں نے جواب دیا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ میں عدالت سے بری ہو جاؤں گا۔ اس لئے ملک بدری قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بہر حال جب ہم ایم ون پر پہنچے اور پولیس گاڑیاں جنوب کی بجائے شمال کی طرف مڑیں تو میں سمجھ گیا کہ مجھے لندن ایئرپورٹ نہیں کہیں اور لے جایا جا رہا ہے۔ کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لیسٹر جیل پہنچے۔ لیسٹر کا ہائی سیکیورٹی (High Security) جیل برطانیہ کے سخت ترین جیلوں میں سے ایک ہے اور یہاں انتہائی خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔ اس کے حفاظتی انتظامات دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے مجھے استقبالیہ کے ساتھ ہی ایک سیل میں ڈالا گیا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک وارڈر کھانا لے آیا۔ میں نے اسے کہا میں مسلمان ہوں یہ کھانا نہیں کھاتا۔ اس نے گندی سی نسلی گالی دے کر کہا میں اس قسم کی کوئی بکواس سننے کے لئے تیار نہیں اور کھانا وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور وارڈر آیا اس نے بھی انتہائی کرخت انداز میں پوچھا کہ کھانا کیوں نہیں کھایا۔ میں نے کہا میں مسلمان ہوں یہ کھانا نہیں کھاتا۔ وہ بھی دوچار بنا کر چلا گیا۔ (ابتدا ہی میں قیدیوں سے یہ برتاؤ وہاں قصداً کیا جاتا ہے تاکہ اس پر نفسیاتی اثر پڑے۔) اس کے بعد دو اور وارڈر آ گئے اور مجھے ایک راہداری میں لے گئے اور سارے کپڑے اتارنے کے لئے کہا۔ میں نے کہا میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کہنے لگے یہ یہاں کا قانون ہے۔ میں نے کہا یہ اخلاقی قدروں کے خلاف ہے دونوں کچھ شریف سے انسان نظر آتے تھے کہنے لگے خود ہمیں قیدیوں سے ایسا کرنے کے لئے کہتے ہوئے کوفت ہوتی ہے لیکن یہ ایک ہائی سیکیورٹی جیل ہے۔ یہاں ایسا کرنا ضروری ہے۔ اس دوران ایک انگریز قیدی بھی دوسری راہداری کی طرف گیا اور سارے کپڑے اتار کر بالکل ننگا کھڑا ہو گیا اور اس کے بعد پھر کپڑے پہنے۔ بہر حال مجبوراً مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا لیکن مجھے اس بے شرمی سے شدید کوفت ہوئی۔ اس کارروائی کے بعد وارڈروں نے ریڈیو پر کسی سے بات کی اور باہر کی طرف چلے گئے۔ دروازے پر ایک وارڈر شیر کی قد کا ایک کتا ساتھ لئے کھڑا تھا۔ میں کتے کو دیکھ کر ہی ڈر گیا لیکن ذاتی خودداری نے مجھے اس کے اظہار کی اجازت نہیں دی بہر حال کتے والا کتے کو لے کر ہمارے ساتھ چلتا رہا۔ یہ انتظام میری طرف سے کسی قسم کے تشدد کے احتمال کے علاج کے طور پر کیا گیا تھا۔ مجھے ان شریف وارڈروں نے بتایا کہ مجھے اے کیٹیگری (A-Catagory) یعنی انتہائی خطرناک دہشت پسندوں

کے لئے مخصوص کلاس الاٹ کی گئی ہے چنانچہ جب بھی میں اپنی سیل سے نکل کر باہر چل قدمی (ورزش) کروں۔ کپڑے بدلنے جاؤں۔ نہانے جاؤں۔ استقبالیہ کی طرف جاؤں یا ہسپتال کی طرف جاؤں کتا میرے ساتھ ساتھ رہے گا اور اگلے پورے تیرہ ماہ تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ بلکہ جب میری بیوی اور بچی ملاقات کے لئے آئیں تو وہ بھی کتے کو دیکھ کر ڈر جاتیں مجھے جس سیل میں ڈالا گیا وہاں بھی خوش رسالے اور عورتوں کی تنگی تصویریں تھیں جو میں نے باہر دالان کی طرف پھینک دیں۔ شام کا کھانا پانچ بجے ملتا تھا۔ چنانچہ مجھے سیل سے باہر نکالا گیا اور دس بارہ افراد کی ایک لائن میں کھڑا کر دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب اے کیٹیکری والے ہیں۔ میں نے وارڈر سے کہا کہ میں مسلمان ہوں یہ کھانا نہیں کھاتا۔ اس نے کہا کہ اس کے لئے تم کل صبح گورنر کو درخواست دو۔ چنانچہ میں نے شام کو بھی کھانا نہیں کھایا رات کو درخواست لکھ کر صبح وارڈر کو دے دی تو اس نے کہا اس درخواست کے لئے ایک فارم ملتا ہے اور فارم والا آفیسر صبح سویرے آکر چلا گیا اب تمہیں کل صبح تک صبر کرنا ہو گا۔ میں نے کہا میں نے تو کل صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ اس نے کہا اس بارے میں میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تم اگر کھانا نہیں کھاتے تو بن لے کر کھاؤ۔ کھانے کے ساتھ چھوٹا سا ایک بن بھی ملتا ہے۔ چنانچہ میں نے بن لے کر پانی کے ساتھ کھایا۔ دوسری صبح کو میں نے فارم والے آفیسر کو آواز دی۔ اس نے آکر میری بات نوٹ تو کی لیکن کہنے لگا سبزی خوروں کے کھانے کی منظوری میں دو تین دن لگ جائیں گے۔ میں نے کہا میں دو دن سے صرف ایک بن کھا رہا ہوں۔ اس نے کہا میں کچھ نہیں کر سکتا اور چلا گیا چنانچہ میرا تیسرا دن بھی ایسے ہی گزرا۔ اگلی صبح تک میں بھوک سے نڈھال ہو گیا تھا۔ جا کر لائن میں کھڑا ہو گیا اور قیدیوں کا عام کھانا لے کر آگے بن والے کے پاس گیا اور اس سے کہا میں یہ کھانا نہیں کھاتا اس کے بدلے تم مجھے دو بن دے دو۔ اس نے ڈانٹنے کے انداز میں انکار کیا تو میں نے شور مچایا کہ تم لوگ انسان ہو یا جانور۔ میں چار دن سے صرف ایک بن اور وہ بھی پانی کے ساتھ کھا رہا ہوں اور تم مجھے دوسرا بن دینے سے انکار کرتے ہو اور وہ بھی اس لہجے میں۔ اس نے پھر بدتمیزی کی تو میں نے بھی اونچی آواز میں اس کا جواب دیا۔ شور مچ کر دو وارڈر مجھے پکڑ کر سیل میں لے گئے۔ اتنے میں ونگ انچارج بھی پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے شور کی وجہ پوچھی۔ میں نے تفصیلات بتائیں چنانچہ اس نے اسی وقت میرے لئے سبزی خوروں کے کھانے کی منظوری دے دی۔ اس طرح چوتھے دن مجھے کھانا ملا۔

برطانیہ میں عام قیدیوں کا کھانا برصغیر کے اونچے متوسط درجے کے لوگوں کے کھانے سے بھی اونچے معیار کا ہوتا ہے۔ سات آئٹمز (Items) میں سے کوئی سے چار چننے ہوتے ہیں۔ گوشت (سور کا) ہفتے میں پانچ دن اور مچھلی دو دن ملتی ہے۔ فروٹ اور سلاڈ ہفتے میں دو دو دن اور پوڈنگ تین دن۔ لیکن سبزی خوروں کو سبزی اور پھلوں پر ہی قناعت کرنی ہوتی ہے۔ سبزی

خور یہودی ہندو اور مسلمان ہوتے ہیں۔ یہودی تو کوئی بھی سور کا گوشت نہیں کھاتا۔ اکثر ہندو اور بہت سے مسلمان (خاص کر ترک اور عرب) سور کا گوشت مزے سے کھاتے ہیں۔ میں نے برصغیر کے کچھ مسلمانوں کو بھی سور کا گوشت اور سور کی چربی میں پکے ہوئے سالن کھاتے دیکھا تو بڑا دکھ ہوا۔ بہر حال برصغیر کے اکثر مسلمان اس سے پرہیز ہی کرتے تھے۔

مجھے یسٹر جیل آئے کوئی ایک ہفتہ ہوا تھا کہ ایک دن میں نے کسی کام کے لئے کال بیل (Call-bell) بجائی۔ کافی دیر کے بعد ایک وارڈر آیا۔ اس وارڈر کے بارے میں مجھے پہلے ہی اندازہ ہوا تھا کہ سخت قسم کا نسل پرست ہے اور ایشیائیوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔ اس نے دروازے کی کھڑکی سے اندر جاکتے ہوئے ایک نسلی گالی دے کر مجھ سے پوچھا کیا بات ہے۔ میں نے اسے کہا شٹ - اپ (Shut-up) تم نے مجھے گالی کیوں دی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آیا اور مجھے مارنے کے انداز میں کھڑا ہو گیا قد میں وہ بھی چھوٹا سا تھا۔ میں نے بھی مکاتباتے ہوئے کہا تم نے مجھے یہ نسلی گالی کیوں دی (برطانیہ میں نسلی گالی دینا قانوناً منع ہے) میں نے اس سے یہ بات اونچی آواز میں کی۔ باہر سے ایک سینئر آفیسر کا گذر ہوا تو شور سن کر اس نے اندر جھانکا۔ مجھ سے پوچھنے لگا کیا بات ہے۔ میں نے کہا اس نے مجھے نسلی گالی دی ہے۔ اس نے وارڈر کو باہر جانے کے لئے کہا اور مجھ سے کہنے لگا۔ اب اس مسئلے کو بھول جائیں۔ میں نے کہا میں آج ہی ہوم سیکرٹری کو خط لکھ رہا ہوں۔ اس نے کہا آپ کو خط لکھنے کا پورا حق حاصل ہے لیکن اس سے یہاں کی فضا آپ کے خلاف ہو جائے گی جو خود آپ کے لئے اچھا نہیں بہر حال اس نے بڑی ڈپلومیسی سے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ چند ماہ بعد اس وارڈر نے ایک اور وارڈر سے مل کر مجھ سے پھر بد تمیزی کی بلکہ اب کے میری بڑی تضحیک کی تو میں نے اونچی آواز میں اسے خوب سنائیں۔ اتفاق سے جیل کا گورنر سامنے والی لائن میں تھا۔ اس نے میرا شور سنا تو ادھر چلا آیا۔ ان چند ماہ کے دوران بہت سی وجوہات کی بنا پر مجھے جیل میں خاصی اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور ان میں سب سے بڑی وجہ ممبران پارلیمنٹ کی طرف سے مجھے ملنے والے خطوط تھے۔ علاوہ ازیں میں نے جیل میں کتاب لکھی تھی اس کا بھی خاصا چرچا ہوا۔ پریس میں مجھ سے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں اور ایک اہم وجہ خود میرا طرز عمل تھا۔ میں نے دوسرے قیدیوں کی طرح کبھی چھپھورے پن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا نہ ہی بلا وجہ کسی سے لڑتا تھا۔ میری گفتگو بھی خود وہاں کے افسروں کے بقول بڑی منہذب تھی۔ چنانچہ بجز چند نسل پرست وارڈروں کے سب میرا احترام کرتے تھے۔

میں نے جب گورنر کو اپنے شور کی وجہ بتائی تو اس نے معافی مانگی میرے سامنے تو ان وارڈروں کو کچھ نہیں کہا لیکن اس کے بعد ان دو وارڈروں کی ڈیوٹی میرے علاقے میں کبھی نہیں گئی۔

مجھے یسٹر جیل میں آئے چند دن ہوئے تھے کہ ورزش کے دوران ایک قیدی نے مجھے

بتایا کہ جیل کی لائبریری میں اچھی کتابیں ہیں۔ چنانچہ دوسرے دن میری درخواست پر مجھے لائبریری لے جایا گیا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ بھارت سے متعلق وہاں درجنوں کتابیں ہیں ان میں ہندی کتابیں بھی تھیں اور انگریزی بھی۔ مہاتما گاندھی ہی کی انگریزی زبان میں تین سوانح عمریاں تھیں۔ پاکستان سے متعلق ایک کتاب بھی نہیں تھی۔ اردو میں بھی چند ناولوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے عظیم ہستیوں کی سوانح عمریاں لے لیں اور ایک ہفتے میں سب پڑھ ڈالیں۔ ایسٹر جیل میں آٹھ ماہ کی اسیری کے دوران میں نے درجنوں اچھی کتابیں پڑھیں۔ کچھ کتابیں گورنر کے کہنے پر لائبریرین نے شہر کی بڑی لائبریری سے منگا کر مجھے دیں۔ چنانچہ اسیری کے دوران عظیم ہستیوں - تاریخ اور بین الاقوامی تعلقات (جو میرے پسندیدہ مضامین رہے ہیں) کے بارے میں میری معلومات میں خاصا اضافہ ہو گیا۔

میں نے 1983ء میں نظریہ خود مختار کشمیر کے عنوان سے سوال جواب کی شکل میں ایک کتاب لکھی تھی۔ بعد میں میں نے محسوس کیا کہ اس میں سب سے اہم سوال (خود مختار کشمیر سے خود کشمیریوں کو کیا فائدہ ہو گا) کا جواب بہت ہی مختصر دیا تھا۔ چنانچہ میں نے تہیہ کیا تھا کہ فرصت ملے ہی صرف اس عنوان پر ایک کتاب لکھوں۔ لیکن دو سو دو سال تک لبریشن فرنٹ سے متعلق معاملات خاص کر اندرونی بحرانوں نے مجھے ایسا کرنے نہیں دیا۔ اور اب میں بدترین حالات سے بہترین استفادہ کرو، کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اس فرصت سے استفادہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے بیڈ فورڈ جیل میں ہی کتاب لکھنی شروع کی۔ لیکن وہاں سے چند دن بعد ہی ایسٹر جیل لایا گیا۔ ایسٹر جیل پہنچنے کے ہفتہ دس دن بعد ہی میں نے کتاب لکھنی شروع کی۔ موڈ بھی مناسب تھا۔ چنانچہ تقریباً تین ہفتوں میں کتاب کا مسودہ تیار ہو گیا۔ گورنر راولڈ پر آیا تو میں نے اس سے کہا کہ میں نے کتاب لکھی ہے اور اسے شائع کرانا ہے اس سلسلے میں آپ کے ہاں طریقہ کیا ہے۔ اس نے کہا کم از کم میری ملازمت کے دوران کسی قیدی نے کتاب نہیں لکھی اس لئے مجھے طریقہ کار کا علم نہیں۔ میں ہوم آفس سے پوچھ لوں گا۔ دوسرے دن اس نے آکر مجھے بتایا کہ آپ مسودہ مجھے دے دیں ہم اس کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر فیصلہ کریں گے کہ اسے شائع کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ میں نے گورنر ہی کی تجویز پر مسودے کی تین فوٹو سٹیٹ کاپیاں کرائیں اور ایک اسے دے دی۔ تین ماہ بعد مجھے اطلاع دی گئی کہ اسے شائع کیا جاسکتا ہے چنانچہ میں نے مسودہ گورنر ہی کے ذریعہ باہر افضل جاتکوی صاحب کو بھیج دیا اور کتابچہ ”خود مختار کشمیر کیوں“ کے عنوان سے اگست 1986ء میں حکایت پریس لاہور سے شائع ہوا۔ اور اس نے نظریہ خود مختار کشمیر کو کشمیری نوجوان میں مقبول کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ایسٹر میں کوئی ایک ماہ کے قریب ہوا تھا۔ ایک دن شام کو پیشاب وغیرہ کے لئے سیل

سے باہر آیا تو دیکھا وہاں چار سکھ کھڑے ہیں۔ مجھے اخبار سے معلوم ہوا تھا کہ راجیو گاندھی کی برطانیہ آمد سے پہلے خالصتان تحریک کے حامی کچھ سکھ گرفتار ہوئے ہیں۔ میں نے ان کے نزدیک پہنچ کر مسکراتے ہوئے خالصتان زندہ باد، کہا تو وہ حیران سے ہوئے۔ ایک نے مجھ سے پوچھا آپ کشمیر لبریشن فرنٹ کے امان اللہ خان تو نہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ اس پر چاروں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ کچھ پریشان سے تھے میں نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ دوسرے دن دوپہر کو ایک سینئر آفیسر میرے پاس آیا اس نے کہا مسٹر خان اگر آپ برا نہ مانیں تو سردار صاحبان کو جیل رولز کے بارے میں ذرا تفصیلات بتائیں۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ چنانچہ ان چاروں کو ایک ہی سیل میں جمع کیا گیا۔ اور میں نے تھوڑی دیر تو انہیں جیل رولز بتائے اس کے بعد ہم دیر تک خالصتان اور خود مختار کشمیر پر بحث کرتے رہے۔ ان میں سے ایک تو عام سا انسان تھا جو چند دن کے بعد ضمانت پر رہا ہو گیا البتہ تین بہت جذباتی اور کٹر خالصتانی تھے۔ چند دن کے بعد ان لوگوں کو دوسرے ونگ میں شفٹ کیا گیا۔ غالباً ان کو میرے والے ونگ میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ البتہ ورزش کے وقت ہم ملتے اور گپ شپ ہوتی۔ میری یسٹریل جیل سے منتقلی کے چند ماہ بعد میں نے اخبار میں پڑھا کہ تینوں کو لمبی سزائیں دی گئیں۔

جیل میں پشاور کا ایک نوجوان شنزاد اور کزئی اور آزاد کشمیر کا محمد رؤف بھی تھے۔ دونوں عام کلاس میں تھے گو دونوں پر قتل کا الزام تھا۔ ان دونوں نے ابتدائی دنوں میں اور بعد میں بھی بڑی حوصلہ افزائی اور مدد کی۔ دونوں کو بعد میں عمر قید کی سزا ہوئی۔

ایک دن صبح سویرے میں نے محسوس کیا کہ میری نبض ہر دو سیکنڈ کے بعد ایک سیکنڈ کے لئے بند ہو جاتی ہے میں نے اس کی اطلاع ڈیوٹی آفیسر کو دے دی تو وہ مجھے نیچے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے میری نبض دیکھنے کے بعد چیف میڈیکل آفیسر کو فون کیا اور مجھے جیل کے ہسپتال بھیج دیا۔ ہسپتال کی چیف میڈیکل آفیسر ایک لیڈی ڈاکٹر (Dr Penta) نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی ایکمرے والے کو ہدایات دی تھیں چنانچہ فوراً ہی میرا ایکمرے لیا گیا اور مجھے ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ دوسرے دن صبح مجھے ڈاکٹر پیشا نے بتایا کہ باہر سے ایک ماہر ڈاکٹر (Consultant) میرے تفصیلی معائنے کے لئے آ رہا ہے۔ ماہر نے میرا تفصیلی معائنہ کیا اور مجھے سگریٹ کم کرنے کی ہدایت کرنے کے علاوہ ڈاکٹر پیشا کو تحریری رپورٹ بھی دی چند دن کے بعد مجھے ڈاکٹر پیشا نے بتایا کہ میرے مزید اور تفصیلی طبی معائنے کے لئے مجھے باہر شہر کے جدید ترین ہسپتال بھیجا جا رہا ہے۔ چنانچہ مجھے ایک پولیس گاڑی میں جس کے آگے پیچھے پولیس کی ایک ایک کار بھی تھی باہر لے جایا گیا۔ حسب معمول سائرن بجتا رہا۔ ہسپتال پہنچے تو دیکھا سارے ہسپتال کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہے اور لوگوں کو استقبالیہ اور راہداری سے بھی ہٹا دیا گیا ہے۔ مجھے گاڑی سے اتارتے ہی پولیس نے اپنے گھیرے میں لے کر دوڑتے ہوئے اندر ایک

کمرے میں پہنچایا جہاں دو نرسیں انجکشن لئے تیار کھڑی تھیں۔ وہ پولیس کے اس انتظام دوڑ دھوپ - سائرن وغیرہ کی وجہ سے بہت نروس (Nervous) ہو گئی تھیں اور تھرا رہی تھیں۔ غالباً وہ مجھے ایک غیر معمولی دہشت گرد تصور کرتی تھیں۔ انجکشن لگاتے ہوئے بھی نرس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا سسٹر میں کوئی جن نہیں انسان ہوں اور وہ بھی مہذب قسم کا میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا۔ آرام سے انجکشن لگاؤ ایسا نہ ہو کہ سوئی میرے جسم کے اندر ہی ٹوٹ جائے۔ میں نے اس سے چند مذاق بھی کئے اور اس کی خوبصورتی کی بھی تعریف کی (واقعی وہ بہت خوبصورت تھی) تب جا کر اس کے اوسان بحال ہوئے اور اس نے انجکشن لگایا۔ اس انجکشن کے تین گھنٹے کے بعد میری سکیٹنگ (Scanning) ہوئی تھی۔ چنانچہ انجکشن لگنے کے بعد مجھے جیل واپس لایا گیا اور تین گھنٹے بعد اسی طرح کے پولیس انتظامات کے تحت ہسپتال لے جایا گیا جہاں میری سکیٹنگ ہوئی۔ یہ سکیٹنگ شاید اطمینان بخش نہیں تھی چنانچہ ایک ہفتہ بعد پھر ہوئی۔ اس کے ایک ہفتہ بعد مجھے گراہی روڈ ہسپتال بھیجا گیا جہاں دل اور ہیمپٹروں کے آپریشن ہوتے ہیں۔ وہاں مجھے بے ہوش کر کے میرے منہ میں ایک نالی ڈال کر میرے ہیمپٹروں کا ایک ٹکڑا نکالا گیا اور اسے کیمیائی تجزیے کے لئے بھیجا گیا۔ اس دوران جیل کے ہسپتال میں مریضوں کی تعداد گنجائش سے زیادہ ہو گئی تھی اس لئے مجھے واپس میری کوٹھری میں بھیجا گیا۔

ایک دن صبح سویرے میرے منہ سے خون آیا میں نے وارڈر کو بلایا جو مجھے نیچے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس وقت ڈیوٹی پر ایک بھارتی نژاد ڈاکٹر تھا۔ اسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم تھا اور اکثر مجھ سے الجھ جاتا تھا۔ میں نے اسے کہا میرے منہ سے خون آیا ہے۔ اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا کیوں بہانے بناتے ہو دانت سے آیا ہو گا۔ جاؤ کوٹھری میں جا کر آرام کرو۔ میں نے کہا ڈاکٹر! خون میرے دانتوں سے نہیں اندر سے آیا ہے۔ وہ پھر بھی منہ بنائے ٹال مٹول کرتا رہا۔ اتنے میں ادھر سے دوسرے (انگریز) ڈاکٹر کا گزر ہوا۔ میں نے اسے آواز دی اور کہا کہ میرے منہ سے خون آ رہا ہے اور یہ ڈاکٹر توجہ نہیں دے رہا۔ اس نے مجھے کھانسنے کو کہا۔ میں زور سے کھانسا تو خون سے میرے ہاتھ میں رکھا ہوا ٹیشو پیپر سرخ ہو گیا۔ انگریز ڈاکٹر نے بھارتی ڈاکٹر کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ اس سے میری فائل بے لی۔ اور مجھے ساتھ لے کر اپنے دفتر کی طرف گیا۔ جہاں سے اس نے ہسپتال فون کر کے مجھے ہسپتال منتقل کر دیا۔ لیسٹر جیل میں اپنے قیام کا باقی عرصہ میں نے ہسپتال میں ہی گزارا۔

گراہی روڈ ہسپتال والوں نے میری رپورٹ کوئی دو ہفتے بعد بھیجی۔ ایک دن ڈاکٹر پیٹا نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ میری خیریت پوچھی اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد نگاہیں نیچی کر کے کہنے لگی۔ مسٹر خان مجھے افسوس ہے کہ آپ کی میڈیکل رپورٹ کوئی حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اس نے میڈیکل کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کوئی بات کی جو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کہا

ڈاکٹر آپ ذرا عام فہم زبان میں بات کریں کیا مجھے سمجھنے کا کینسر ہے۔ ڈاکٹر نے نظریں نیچی کئے ہوئے کہا مسٹر خان مجھے انتہائی افسوس ہے میں آپ کے اس سوال کا جواب اثبات میں دینے پر مجبور ہوں۔ مجھے ایک لمحے کے لئے تو بڑا شاک ہوا لیکن فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اُدھر ڈاکٹر پیشانی مجھ سے نظریں ملائے بغیر ہی مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ میں نے کہا ڈاکٹر پیشانی آپ نے میرے لئے اب تک جو کچھ کیا ہے اس کے لئے آپ کا انتہائی مشکور ہوں۔ بہر حال انسان کو کسی نہ کسی دن مرنا ہے۔ دیر سے نہ سہی جلدی سہی۔ مجھے آپ صرف یہ بتائیں کہ یہ کینسر ناقابل علاج مرحلے پر تو نہیں پہنچا ہے۔ کہنے لگی خوش قسمتی سے نہیں۔ ہاں اگر اس کا فوراً آپریشن نہ ہوا تو چند ماہ میں یہ ناقابل علاج ہو سکتا ہے۔ بہر حال میں نے پورا انتظام کیا ہے۔ کیا آپ آپریشن کے لئے تیار ہیں۔ میں نے کہا بالکل۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے ایک دستاویز پر دستخط لئے اور دروازے تک آ کر مجھے اوپر سیل کی طرف بھیج دیا۔ میں نے سیل میں جا کر خاصے سوچ بچار کے بعد وصیت ناموں کی صورت میں لبریشن فرنٹ کے قائم مقام سربراہ افضل جاتلوی۔ اپنے بھانجے ڈاکٹر محبوب عالم۔ اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کے نام خط لکھے۔ ڈاکٹر محبوب کے نام خط غلطی سے پوسٹ ہو گیا۔ باقی خط اپنے پاس رکھے۔

دوسرے دن افضل جاتلوی صاحب ملاقات کے لئے آگئے تو میں نے اس صورت حال سے انہیں آگاہ کیا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ فی الحال وہ میری اہلیہ کو اس بارے میں کچھ نہ بتائے۔ افضل صاحب نے بے صبری سے میری بیوی کو فون کیا اور ساری صورت حال بتا دی۔ دوسری صبح کو میری اہلیہ انتہائی پریشانی کی حالت میں جیل پہنچ گئی۔ میں نے اسے دلاسا دیا کہ کوئی قابل تشویش بات نہیں اگلے دن ملک لطیف، راجہ ظفر اور غالباً حاجی منظور پہنچے اور ملاقات کے دوران ہی مجھ سے پلٹ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔ میں نے انہیں بھی دلاسا دیا۔ اگلے دن شبیر چوہدری، چوہدری صدیق اور غالباً چوہدری رحمان بھی پہنچے۔

27 فروری 1986ء کو مجھے حسب معمول بھاری گارد میں گراہی روڈ ہسپتال پہنچایا گیا۔ ہسپتال میں بھی مجھ پر جیل والوں اور عام پولیس کا مشترکہ پہرہ تھا۔ دوسرے دن یعنی 28 فروری 1986ء کو صبح سویرے مجھے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ میں نے باہر ایک نظر ڈالی کیونکہ یہ میری زندگی کا آخری دن بھی ہو سکتا تھا بہر حال حوصلہ نہیں ہارا۔ اور ہشاش بشاش رہا۔ آپریشن ٹیبل پر لٹائے جانے کے بعد بھی میں ڈاکٹر اور نرسوں سے ہنس کر بات کرتا رہا میرا آپریشن برطانیہ کے مشہور سرجن ڈاکٹر بلی کر رہے تھے۔ جیل کا ایک آفیسر آپریشن روم میں بھی موجود تھا۔ یہ سب میرے اس حوصلے پر خاصے حیران تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے انجکشن دیا گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو ہسپتال کے کمرے میں مشنری سے جکڑا ہوا تھا۔ مجھے ہوش آتے ہی ڈیوٹی والی جونیئر ڈاکٹر (اس کا نام بھی بلی، مس بلی تھا) نے مبارکباد دی۔ کہ آپریشن کامیاب ہو گیا اور یہ

آپریشن کوئی چار گھنٹے کا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر غنودگی چھا گئی۔ خاصی دیر کے بعد ہوش آیا تو مس بلی نے کہا۔ شبیر چوہدری پہلے آپریشن روم کے باہر، پھر یہاں باہر دن بھر بیٹھا رہا۔ چار بجے کے قریب میری بیوی آئی۔ بچی بھی ساتھ تھی لیکن میں نے اسے کہا کہ بچی کو اندر مت لاؤ۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر شائد گھبرا جائے۔ بہر حال نرسوں نے بھی اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔

میری بیوی کے جانے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد میں نے محسوس کیا کہ میری نبض ست ہو گئی ہے۔ پیشاب بھی بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سانس بھی اکھڑنے لگی اور ہلکی لگنے لگی جیسے مرتے وقت لگتی ہے تو میں نے مس بلی کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا آخری وقت آگیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن پر میری موت کے تحریک آزادی، تنظیم اور میری بیوی اور بچی پر پڑنے والے ممکنہ اثرات چھا گئے اور دونوں آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ساتھ ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو ڈاکٹر مس بلی سر پر کھڑی تھی۔ اس نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا مسٹر خان تم اب خطرے سے باہر ہو۔

دوسری صبح کو جیل کا ڈپٹی گورنر اور ایک سینئر افسر مجھے دیکھنے آئے میں نے مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا تو دونوں حیران ہو گئے۔ آفسر نے کہا خان ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ آہ آہ کرتے ہوں گے اور آپ مسکرا رہے ہیں۔ مبارک ہو، سنا ہے آپریشن کامیاب ہو گیا ہے میں نے دونوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس دن میرے بے شمار کشمیری دوست مجھ سے ملنے دور دور شہروں سے آئے لیکن کسی کو ملنے کی اجازت نہیں ملی بلکہ میدان کی طرف والی کھڑکیوں پر کالے پردے ڈالے گئے۔ البتہ تیسرے دن نظامی صاحب اور عظمت خان جیل افسروں کی منتیں کر کے دو دو منٹ کے لئے اندر آنے میں کامیاب ہو گئے۔ شبیر چوہدری کو میرے پاس کافی دیر تک بیٹھنے کی اجازت ملی۔ چوتھے روز مجھے جیل منتقل کر دیا گیا۔ جہاں دس دن بعد ٹانگے کھولے گئے۔ اس دوران ایک فزیو تھراپسٹ (Physiothrapist) روز آکر مجھ سے ورزش کراتا رہا۔ ڈاکٹر بلی بھی ایک بار آیا۔ گورنر اور دوسرے سینئر آفسر آکر میری خیریت پوچھتے رہے۔ ڈاکٹر بیٹا تو روز آکر کہتی مسٹر خان مجھے ایک مسکراہٹ دے دو۔ پھر کہتی پرواہ مت کرو تمہارا کشمیر ایک دن ضرور آزاد ہو جائے گا۔ یہ سب مجھے خوش رکھنے کے لئے اس کے نفسیاتی اقدامات تھے۔ ہسپتال کے دوسرے اسٹاف نے بھی میرا بہت خیال رکھا میں نے گراہی روڈ ہسپتال جانے سے پہلے اپنے وصیت نامے جیل کے ہسپتال کے آفس انچارج کو یہ کہہ کر دیئے تھے کہ اگر میں آپریشن کے دوران مر گیا تو انہیں پوسٹ کر دینا۔ واپس آیا تو واپس لے لوں گا۔ چنانچہ واپسی پر میں نے اس سے وہ خط واپس لے لئے۔

جیل میں ابتدائی تین ماہ تک بجز میری بیوی اور بچی کے کسی کو مجھ سے ملاقات کی

اجازت نہیں تھی۔ یہ اجازت وزیر داخلہ دیتا تھا جسے میں نے تقریباً پچاس افراد کے نام بھیجے تھے کہ انہیں مجھ سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ تین ماہ بعد صرف بارہ افراد کو اجازت دی گئی۔ ابتدائی دور میں ہی ایک دن مجھے ملاقاتوں کے کمرے میں لایا گیا جہاں ایک صاحب بیٹھے تھے جنہیں میں نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے اپنا تعارف ایم۔ ایچ۔ بٹ صدر پاکستان ایسوسی ایشن یسٹر کی حیثیت سے کرایا۔ بعد میں کچھ دن میرے لئے کھانا بھی بھیجتے رہے۔ ایک دن پھر ملنے آئے اور مجھ سے سیاسی سوالات کرنے لگے۔ میں نے جواب دیئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ دوسری بار وہ بھارت کے ایک مشہور قومی اخبار کے نمائندے کے ایماء پر آئے تھے اور جب انہوں نے واپس جا کر میرے جوابوں کا خلاصہ بتایا تو اخبار والے نے اسے انٹرویو کی شکل دے کر اپنے اخبار میں شائع کرایا۔

مجھے ریمانڈ کے لئے ہر جمعرات کو جیل سے عدالت لے جایا جاتا تھا۔ عدالت جیل سے کوئی تین کلو میٹر دور تھی۔ اپنی سیل سے نکال کر مجھے استقبالیہ میں لایا جاتا۔ جہاں میرے ذاتی کپڑے پہننے کو دیئے جاتے۔ اس کے بعد دوسرے کچھ لوازمات کے بعد کٹے کے زیر حفاظت جیل کے بڑے دروازے پر لایا جاتا وہاں ایک بڑی وین، دو کاریں اور ایک موٹر سائیکل میرے منتظر ہوتے مجھے ہتھکڑیاں لگا کر وین میں بٹھایا جاتا جس میں چھ وارڈر اور افسر بلیٹ پروف جیکٹ پہنے بیٹھ جاتے۔ ایک کار وین کے آگے اور ایک پیچھے ہوتی اور دونوں میں بلیٹ پروف جیکٹ پہنے پولیس والے ہوتے۔ موٹر سائیکل پر تیز پیلے رنگ کی جیکٹ پہنے ایک پولیس والا ہوتا جو آگے آگے ہوتا اور جیل کے بڑے دروازے سے نکلتے ہی سائرن بجانے لگتا۔ سائرن سے راستے کی ساری ٹریفک ایک طرف ہو جاتی اور ہماری یہ کانوائے ٹریفک سگنل توڑتی ہوئی تیزی سے عدالت کی طرف بھاگتی۔ پانچ سات منٹ کی اس ”شاہی سواری“ سے میں بہت محفوظ ہوتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی دوسرے ملک کا سربراہ حکومت جا رہا ہے۔ عدالت پہنچ کر مجھے چور دروازے سے اندر لے جایا جاتا۔ عدالت کی عمارت پر بھی مسلح پولیس پہرہ دیتی تھی۔ عدالت کی کارروائی صرف چند منٹ کی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود ہر بار عدالت میں کشمیریوں خاص کر لبریشن فرنٹ کے ممبروں کی ایک کثیر تعداد موجود ہوتی۔ یہ لوگ دور دور سے آتے تھے۔ انہیں جامہ تلاشی کے بعد کمرہ عدالت میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی۔ میں ریمانڈ ملتے ہی واپسی پر اپنے ہموطنوں کو السلام علیکم کہنے کے بعد (V) کا نشان بنا کر انگریزی میں خود مختار کشمیر زندہ باد کا نعرہ لگاتا۔

جیل واپسی پر بھی میری ”شاہی سواری“ اسی شان سے جاتی۔

دراصل یہ سارے حفاظتی انتظامات آئی آر اے (شمالی آئرلینڈ کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کی جدوجہد کرنے والی تنظیم آئرش رپبلیکن آرمی) کے لئے ہوتے ہیں اور چونکہ مجھ

پر بھی دہشت گردی کا الزام لگایا گیا تھا اس لئے آئی اے آر والوں کے لئے مخصوص حفاظتی اقدامات کا اطلاق مجھ پر بھی ہوتا تھا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ نامناسب نہیں کہ اتنے سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود آئی آر اے والے کبھی جیل توڑ کر کے، کبھی جیل حکام پر قابو پا کر اور کبھی عدالت جاتے ہوئے فرار ہوتے رہے ہیں۔

غالباً حکومت کی طرف سے پولیس پر مجھے ہر قیمت پر پھنسانے کا دباؤ تھا (اور مسز تھیچر کی حکومت اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے پولیس سے غلط کام لینے کے لئے مشہور تھی) چنانچہ برطانوی پولیس نے میرے بارے میں اپنی اعلیٰ روایات سے ہٹ کر برصغیر کی پولیس کے سے ہتھکنڈے بھی استعمال کئے۔ مثلاً اس نے برمنگھم میں چوہدری عبدالجید کے ہاں سے ملنے والے دو پرانے پاکستانی پاسپورٹ اور ایک برٹش پاسپورٹ اور کہیں اور سے ملا ہوا ایک ہندوستانی پاسپورٹ میرے سامان میں ڈال دیئے اور میری بار بار تردید کے باوجود یہی کہتی رہی کہ یہ پاسپورٹ تمہارے ہاں سے ملے ہیں اور تم جعلی پاسپورٹوں کا کاروبار بھی کرتے ہو۔ یہاں تک کہ اس نے ابتداً مجسٹریٹ کی عدالت میں بھی یہی موقف اختیار کر کے میری ضمانت کی درخواست مسترد کرا دی۔ آخر سات ماہ بعد اس نے (کیوں کہ یہ مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ میں اٹھنے والا تھا) تسلیم کیا کہ پاسپورٹ میرے ہاں سے نہیں چوہدری جید کے ہاں سے ملے تھے۔

16 ستمبر کو مجھے یسٹر جیل سے لیوٹن پولیس اسٹیشن (مزید پوچھ گچھ کے لئے) لایا گیا حسب معمول حفاظتی انتظامات بڑے سخت تھے۔ لیوٹن پولیس اسٹیشن کے گرد بھی بھاری تعداد میں پولیس کھڑی تھی۔ ہماری گاڑی چند منٹ کے لئے پولیس اسٹیشن کے باہر کھڑی رہی۔ اس اثناء میں گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تین وارڈروں میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔ خان تم تو شریف سے آدمی معلوم ہوتے ہو، یہ کیا کام کیا ہے کہ تمہارے بارے میں اتنے سخت انتظامات ہیں۔ میں نے کہا مجھ پر الزام ہے کہ میں راجیو گاندھی کو قتل کرنا یا کرانا چاہتا تھا، وارڈروں نے اس کا ذکر پولیس والوں سے کیا تو پولیس نے میرے اس جواب کو توڑ مروڑ کر مجھ سے یہ بات منسوب کی کہ میں نے وارڈروں کے سامنے اقرار کیا تھا کہ میں راجیو گاندھی کو قتل کرنا یا کرانا چاہتا تھا اور تینوں وارڈروں کو استغاثہ کے گواہ بنا کر بعد میں عدالت میں پیش کیا تینوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ خان نے ان کے سامنے اقرار کیا تھا کہ وہ راجیو گاندھی کو قتل کرنا یا کروانا چاہتا تھا۔ لیکن عدالت میں میرے بیرسٹر نے اور میں نے ان کے اس سفید جھوٹ کے پرچے اڑائے۔ میرے بیرسٹر نے ان سے ایسے ایسے سوال کئے جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ چنانچہ جیوری والے بھی پوری طرح سمجھ گئے کہ ساری کہانی گھڑی گئی ہے اور یہ جھوٹے لوگ عدالت میں بھی تماشابن گئے۔

مجھ سے پوچھ گچھ کرنے والی پولیس ٹیم کا سربراہ مسٹر رابرٹ ولیم ڈارلس (Robert)

(William Darts) ایک بہت اچھا آفیسر اور اچھا انسان تھا جب کہ اس کا نائب ماکلم والزور تھ (Malcom Wallsworth) اس کے بالکل برعکس۔ والزور تھ مجھ سے بڑے طنزیہ سوال بھی کرتا رہا۔ ایک دن مجھے سنانے کے لئے مسٹر ڈارٹس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ڈارٹس کیا تمہیں معلوم ہے ہم انگریزوں نے ان کشمیریوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح چالیس پنس فی کس کے حساب سے بیچا تھا۔ (اس کا اشارہ معاہدہ امرتسر کی طرف تھا) اس پر ڈارٹس نے اسے کہا کیا یہ تمہارے لئے کوئی فخر کی بات ہے کہ تمہاری قوم بردہ فروشی کرتی رہی ہے۔ اسی طرح ایک بار والزور تھ نے مجھ سے بڑے طنزیہ انداز میں کہا۔ خان تم گنگا ہائی جیننگ اور مہاترے کے اغوا اور قتل کی تفتیشی ٹیموں کے ہاتھوں سے مچھلی کی طرح نکل گئے لیکن ہمارے ہاتھوں سے نہیں نکل سکو گے۔ میں نے کہا دیکھا جائے گا۔ انشاء اللہ تمہیں بھی منہ کی کھانی پڑے گی۔ اور جب ایک سال بعد میں عدالت سے بری ہوا اور والزور تھ مجھے لیوٹن سے بیڈ فورڈ جیل لے جا رہا تھا تو میں نے اسے اس کا ایک سال پہلے کا ریمارک اور میرا جواب یاد دلایا۔ وہ خاصا کھسیانہ ہو گیا اور کہنے لگا دراصل ہمارا بیرسٹر نکما تھا اس نے ہمارے بجائے تمہیں فائدہ پہنچایا۔

11 اپریل 1986ء کی صبح کو ڈاکٹر پیشا نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں کسی دوسری جیل منتقل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤں۔ چنانچہ آدھ گھنٹے بعد افسروں نے آکر مجھے ہسپتال سے نکالا۔ ڈاکٹر پیشا اور دوسرے افسروں نے مجھے نیک دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا اور میں حسب معمول پوری طرح مسلح افسروں کی گارد میں ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ تین گھنٹے بعد مجھے برکسٹن جیل کے میڈیکل ونگ میں پہنچایا گیا۔ برکسٹن جیل میں بھی مجھے ابتدا میں جیل افسروں کی تضحیک آمیز باتیں سننی پڑیں۔ وہ ہر بات پر ایک فحش گالی دیتے (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ان کا تکیہ کلام ہے)۔ میں اپنے حقوق کا مطالبہ کیا کرتا تھا مجھے گندی گالیاں سننی پڑتیں۔ میں نے جیل کی گورنر کے راؤنڈ کے دوران وارڈروں کے رویہ کے خلاف احتجاج کیا تو اس نے تھوڑی دیر کے بعد مجھے ونگ کے دفتر میں بلایا میں نے اسے پوری صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ میں نے کوئی اخلاقی جرم نہیں کیا سیاسی قیدی ہوں اور ایک لکھا پڑھا انسان ہوں۔ اس نے یقین دلایا کہ آئندہ میرے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں ہو گا۔ دوسرے دن جیل کے چیف آفیسر نے مجھے اپنے دفتر بلایا اور کہنے لگا مسٹر خان مجھے افسوس ہے کہ میرے کچھ افسروں کے طرزِ تکلم سے آپ کو ذہنی تکلیف پہنچی ہے۔ دراصل اس میں ان کا بھی کوئی بڑا قصور نہیں اس لئے کہ ہمارے جیل کے اکثر ایشیائی قیدی عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں اس لئے وہ اس برتاؤ کے مستحق ہیں (میں نے بعد میں محسوس کیا کہ چیف آفیسر ٹھیک کہتا تھا۔ میں نے بہت سے ایشیائی قیدیوں کو انتہائی غیر مہذب حرکتیں کرتے دیکھا) بہر حال آپ ایک لکھے پڑھے شریف انسان معلوم ہوتے ہیں اس لئے آئندہ کوئی آپ سے غیر مہذبانہ برتاؤ نہیں کرے گا۔ کچھ مدت بعد ایک افسر نے جو

غالباً نیا تھا اور اسے میرے بارے میں ہدایات نہیں ملی تھیں مجھ سے بدزبانی کی۔ میں نے احتجاج کیا تو اس نے مجھے دھکا دیا جس کی وجہ سے میں پھسل کر گر گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ قانون کے تحت کوئی افسر کسی قیدی کو دھکا دینے کا مجاز نہیں۔ چنانچہ میں نے اونچی آواز میں احتجاج کیا کہ تم نے مجھے کس قانون کے تحت دھکا دیا ہے۔ اس نے کہا تم قاتل ہو (میری سیل والی قطار میں سب قاتل قیدی تھے وہ سمجھا میں بھی قاتل ہوں) میں نے احتجاجاً کہا میں قاتل نہیں سیاسی قیدی ہوں۔ تم میرے ساتھ یہ غیر انسانی سلوک کیوں کر رہے ہو۔ چونکہ اس وقت صفائی کے لئے سب قیدی باہر نکلے ہوئے تھے اور میرا شور سن رہے تھے۔ ان میں سے سب قیدیوں نے اونچی آواز میں کہا شاہابش خان شاہابش تم سچ کہتے ہو یہ لوگ ہمیں انسان ہی نہیں سمجھتے۔ بگڑی ہوئی صورت حال کو دیکھ کر مجھے لے جا کر سیل میں بند کر دیا گیا اور صفائی کا وقفہ بھی ختم کر دیا گیا۔ دوسرے دن اس افسر نے آکر مجھ سے معذرت کی۔ غالباً گورنر کی ہدایات کے تحت۔

برکسٹن جیل میں گورنر مس کنگسلی (Miss Kingsley) جو برطانیہ کی پہلی خاتون جیل گورنر تھیں) سمیت اکثر افسر بہت اچھے تھے البتہ ایک چھوٹی سی تعداد انتہائی نسل پرست۔ اور یہ لوگ اپنے نسل پرستانہ جذبات کا عملی مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔ ایک بار رات کو میرے سینے میں شدید درد اٹھا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ آدھ گھنٹہ تک کوئی نہیں آیا۔ دوسری بار گھنٹی بجائی تو کوئی پندرہ منٹ بعد ایک افسر آیا اور انتہائی تھکمانہ انداز میں پوچھنے لگا تمہیں کیا تکلیف ہے کیوں بار بار گھنٹی بجاتے ہو۔ میں نے کہا میں پونے گھنٹے سے گھنٹی بجا رہا ہوں اور تم لوگوں کو پرواہ ہی نہیں میرے سینے میں درد ہے اگر میں مر گیا تو اس کی ذمہ داری تم پر عاید ہوگی۔ اس پر اس نے گندی سی گالی دے کر کہا اگر تم مر گئے تو ہماری ذمہ داری صرف یہ ہوگی کہ مردہ خانہ سے سڑیچر منگا کر تمہاری پلید لاش کو مردہ خانہ بھیج دیں۔ اب بکواس بند کرو اور سو جاؤ۔ یہ کہہ کر اس نے چند اور گندی گالیاں دیں اور چلا گیا۔ کوئی دس منٹ بعد ایک سینئر افسر آیا مجھ سے تکلیف کی نوعیت پوچھی اور ونگ کے دواخانہ سے وقتی طور پر درد کم کرنے کی دوا دی اور پہلے افسر کے رویہ پر معذرت بھی کی۔

برکسٹن جیل میں بھی بہت سے ایشیائی ڈاکٹر تھے۔ میری میڈیکل فائل ایک بھارتی لیڈی ڈاکٹر کے حصے میں آئی تھی جس نے مجھے ذہنی اذیت دینے اور میرے علاج کے سلسلے میں غیر انسانی رویہ اختیار کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

17 جولائی 1986ء کو (گرفتاری کے تقریباً ساڑھے دس ماہ بعد) لندن سے کوئی بیس میل باہر سینٹ آلبنز (St. Albans) کے کراؤن کورٹ (کراؤن کورٹ سیشن کورٹ کے ہم مرتبہ ہوتی ہے) میں ہائی کورٹ کے ایک اسپیشل جج کے پاس میرے کیس کی سماعت شروع ہوئی۔ عدالت جج اور اس کے اسٹاف کے علاوہ بارہ ممبران جیوری (جرمہ) پر مشتمل تھی۔ جیوری میں سات مرد اور

پانچ عورتیں تھیں۔ جیوری کے ممبر قانون دان نہیں، بلکہ عام لوگ ہوتے ہیں۔ جج کا کام جیوری کے سامنے الزام کی نوعیت اور متعلقہ قانون کی وضاحت کرنا ہوتا ہے جب کہ جیوری شہادتوں اور وکلاء کے دلائل کی روشنی میں ملزم کو مجرم یا بے گناہ قرار دیتی ہے۔ فیصلے کے حق میں جیوری کے بارہ ممبروں میں سے کم سے کم دس ووٹ آنا ضروری ہوتے ہیں ورنہ کیس دوبارہ شروع کیا جاتا ہے۔ ملزم کو مجرم قرار دیئے جانے کی صورت میں اس کی سزا کا تعین جج کرتا ہے۔

مجھ پر دو متبادل الزام لگائے گئے تھے۔ ایک یہ کہ کیمیائی مواد جو پولیس کو میرے گھر (لیوٹن) سے ملا تھا۔ اس سے میں برطانیہ میں دہشت گردی کے اقدامات کرنا چاہتا تھا اور بصورت دیگر یہ مواد برطانیہ سے باہر (بھارتی مقبوضہ کشمیر میں) دہشت گردی کے لئے استعمال ہونا تھا۔

میرا قانونی دفاع برطانیہ کے ہاؤس آف لارڈز کے رکن بیرسٹر لارڈ جیفورڈ (Lord Gifford) ان کے معاون بیرسٹر سپونر (Spooner) (کچھ دن سپونر کی جگہ بیرسٹر مس ایزابیلا (Miss Isabela) بھی کام کرتی رہیں) وکیل مس لوئس کریمین (Luis Christian) اور اس کی معاون مس ٹرویلہ (Miss Tervilla) نے کیا۔

استغاثہ کی طرف سے ایک بیرسٹر اور اس کی ایک بڑی ٹیم تھی۔ استغاثہ کی طرف سے بہت سے پولیس آفیسر، تربیت یافتہ کتے کا انچارج، ایک ایشیائی مترجم، آتش گیر مادے کے تین ماہرین، کیمیائی تجزیہ کی لیبارٹری کے انچارج، لیسٹر جیل کے تین افسر اور دو کیمسٹ بطور گواہ پیش ہوئے اور میرے دفاع میں یعنی صفائی کی طرف سے برمنگھم کے ممبر پارلیمنٹ ٹیری ڈیوس (Terry Davis) ماہنامہ صراطِ مستقیم کے ایڈیٹر اور تحریک کشمیر کے رہنما مولانا محمود احمد میرپوری مرحوم اور لبریشن فرنٹ کے شبیر چوہدری، راجہ ظفر خان اور حاجی منظور احمد صاحب پیش ہوئے۔ بہت سے دوسرے پاکستانیوں، کشمیریوں اور انگریزوں نے صفائی کے گواہوں کی حیثیت سے پیش ہونے کی پیشکش کی تھی لیکن لارڈ جیفورڈ نے ان کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھ پر سات گھنٹے تک (دو دن) جرح ہوئی۔ لارڈ جیفورڈ نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں جرح کے دوران سیاسی معاملات کو زیر بحث لانے سے احتراز کروں۔ کیوں کہ برطانیہ کی جیوری فوجداری معاملات میں سیاست کو زیر بحث لانا پسند نہیں کرتی۔ لیکن میں نے جہاں جہاں مناسب اور ضروری سمجھا تحریک آزادی کشمیر اور مسئلہ کشمیر کے متعلقہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی کیوں کہ میں اس مقدمے کو بھی تحریک آزادی کشمیر کے حق میں اور اس کی تشمیر کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ استغاثہ کے بیرسٹر کی طرف سے مجھ سے کئے جانے والے سوالات سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ بھارتی ہائی کمیشن اس کی پوری بریفنگ کرتا ہے۔ کیس پانچ دن چلا اور 21 جولائی کو جیوری نے ایک کے مقابلے میں گیارہ ووٹوں سے مجھے پہلے الزام سے بری کر دیا البتہ دوسرے الزام کے سلسلے میں میرے حق میں مطلوبہ کم از کم دس ووٹ نہیں آئے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ دوسرے الزام کے

سلسلے میں کیس کی سماعت دوبارہ ہو جائے اور اس دوران میں جیل میں رہوں۔
مجھے برکسٹن جیل سے صبح سویرے سینٹ آبنز لایا جاتا تھا کیوں کہ بعد میں ٹریفک بڑھ جانے کی وجہ سے میرے بارے میں حفاظتی انتظامات میں خلل پڑنے کا احتمال ہوتا تھا۔ عدالت میں سماعت شروع ہونے تک مجھے عدالت کے نیچے بنے حوالات کے کمروں میں سے کسی ایک میں رکھا جاتا تھا۔ مردوں کے حوالات کی دیواروں پر انتہائی فحش عبارت لکھی ہوئی تھی۔ یہ عبارت قیدی لکھتے تھے۔ دو دفعہ مردانہ حوالات میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے زنانہ حوالات میں رکھا گیا۔ میں نے وہاں عورتوں کے ہاتھ کی لکھی جو فحش عبارتیں دیکھیں اس سے میرے رونگٹھے کھڑے ہو گئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنے آپ کو انتہائی مہذب گردانے والے مغربی معاشرے کی خواتین حیوانیت کی اس سطح پر پہنچ سکتی ہیں۔

دوسری دفعہ کیس کی سماعت 19 ستمبر کو شروع ہوئی استغاثہ نے وہی گواہ پیش کئے اور ہماری طرف سے بھی تقریباً وہی گواہ پیش ہوئے۔ میرا بیان اور کراس ایگزامینیشن اب کے چھ گھنٹے تک ہوا۔ جج بھی دوسرا تھا اور جیوری بھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیوری کی اکثریت مجھ سے ہمدردانہ جذبات رکھتی ہے جو ان کے چروں سے عیاں تھے اس میں لارڈ جیفورڈ کی طرف سے استغاثہ اور صفائی کے گواہوں پر کی جانے والی جرح اور بعد میں دلائل کا بڑا ہاتھ تھا۔ میں نے اب کے تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور وضاحت کی۔ جب میں نے نومبر 1947ء میں جہوں میں مسلمانوں کے قتل عام کی منظر کشی انتہائی جذباتی انداز میں کی تو میں دیکھ رہا تھا کہ جیوری کی چند خواتین آنسو پونچھ رہی تھیں۔

اگرچہ مجھے پورا یقین تھا کہ میں کیس میں بری ہو جاؤں گا لیکن میں نے شروع سے ہی اپنے آپ کو ذہنی طور پر عمر قید کی سزا اور بصورت دیگر برطانیہ بدری کے لئے تیار کر رکھا تھا اور دونوں کو تحریک آزادی کے لئے اپنی قربانی تصور کرتا تھا۔ مجھے پوچھ گچھ کے دوران پولیس افسروں کی باتوں سے بھی اندازہ ہوا تھا کہ برطانیہ کی حکومت بھارتی حکومت کی طرف سے شدید دباؤ کے نتیجے میں مجھے کسی نہ کسی قسم کی سزا دینے پر تلی ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے وکلاء سے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ مجھے کسی نہ کسی قسم کی سزا ضرور دی جائے گی۔

23 ستمبر کو بارہ بجے وکلاء کے دلائل ختم ہو گئے تو جج نے جیوری کو مناسب ہدایات دیں اور جیوری کیس پر آپس میں بحث کر کے نتیجہ اخذ کرنے اور فیصلے پر پہنچنے کے لئے اپنے مخصوص کمرے میں چلی گئی اور مجھے حوالات میں لے جایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے وکلاء نے مجھے وکلاء کے کمرے میں بلایا اور ہم وہاں گپ شپ کرتے رہے دونوں بار کیس کی سماعت کے دوران عدالت کی گیلری کشمیریوں سے بھری ہوتی تھی 23 ستمبر کو تو گیلری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ عدالت کی کارروائی ختم ہونے کے بعد وہ لوگ بھی باہر لان میں فیصلے کا انتظار کرتے رہے۔ پریس

والے بھی تھے۔

جیوری کبھی تو فیصلہ چند گھنٹوں میں دیتی ہے اور کبھی کئی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ یہ وقت ملزموں کی قسمت کے فیصلے کا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس دوران ملزم عام طور پر بہت پریشان رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ بے ہوش بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر بڑی سے بڑی سزا کے لئے تیار رکھا تھا۔ اس لئے میں مطمئن تھا اور اپنے وکلاء سے ہنسی مذاق کرتا رہا۔ بلکہ اس دن کچھ زیادہ ہی مذاق کرتا رہا۔ اس پر مس کرچن نے کہا بھی کہ حیرانگی ہے کہ تجھے کیس کی فکر ہی نہیں جب کہ دوسرے ملزم اس موقع پر عموماً روتے یا تھرتھراتے رہتے ہیں اور دعائیں مانگتے رہتے ہیں میں نے کہا کہ مجھے اس لئے فکر نہیں کہ اگر مجھے قید کی سزا ہوئی بھی تو میں یہ سزا اپنے وطن کی آزادی کے لئے قربانی کے طور پر کاٹوں گا۔ اور وطن کی آزادی کے لئے قربانی دینا میرا قومی فرض ہے۔ ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک افسر لارڈ جیفورڈ کو باہر لے گیا وہ آدھ گھنٹے کے بعد لوٹے تو خاصے پریشان نظر آتے تھے۔ اپنی کرسی میرے نزدیک لا کر بیٹھ گئے اور انتہائی مغموم انداز میں کہنے لگے۔ مسٹر خان مجھے انتہائی افسوس ہے کہ ہم آپ کو نہ بچا سکے۔ ہوم سیکرٹری (وزیر داخلہ) کی طرف سے آپ کے کیس میں بری ہونے کی صورت میں آپ کے برطانیہ بدری کے احکامات جاری ہوئے ہیں۔ میں نے لارڈ جیفورڈ سے کہا میرے لئے یہ صورت حال غیر متوقع نہیں۔ میں شروع سے ہی کہتا رہا ہوں کہ مجھے کسی نہ کسی قسم کی سزا ضرور دی جائے گی۔ اس لئے کہ برطانوی حکومت پر اس سلسلے میں بھارتی حکومت کا دباؤ ہے بلکہ بھارتی حکومت اس سلسلے میں برطانوی حکومت کو بلیک میل کر رہی ہے۔ لارڈ جیفورڈ کی بات سنتے ہی مس کرچن نے رونا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسے دلاسا دیا تو وہ اور بھی اونچی آواز میں رونے لگی اور کہنے لگی مسٹر خان ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ ہم آپ کو نہ بچا سکے۔ میں نے کہا مس کرچن آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ آپ لوگوں نے ضرورت اور توقع سے کہیں زیادہ محنت کی۔ اس سے زیادہ آپ لوگ کیا کر سکتے تھے۔

کوئی ایک گھنٹہ کے بعد مجھے عدالت میں لے جایا گیا اور جیوری کے لیڈر (Foreman) نے میری بریت کا اعلان کیا۔ اس کے بعد جج نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مسٹر خان جہاں تک اس عدالت کا تعلق ہے آپ اب آزاد ہیں۔“ جج کے چہرے پر بھی خاصی پریشانی نظر آتی تھی۔ مجھ سے مخاطب ہونے کے ساتھ ہی وہ اپنے چیمبر کی طرف چلے گئے۔ اس اثناء میں شاید جیوری والوں کو بھی نئی صورت حال کا علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ عدالت سے باہر نکلنے وقت جیوری کے ممبر خاص کر خواتین میری طرف انتہائی ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ جیوری والوں کے جانے کے بعد پولیس والوں نے مجھ سے کہا آپ نیچے جا کر اپنا سامان لے لیں۔ میں نیچے گیا تو نیچے پورے علاقے کو پولیس نے گھیر رکھا تھا۔ والنور تھ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ مسٹر خان میں

آپ کو گرفتار کر رہا ہوں۔ میں نے کہا تم مجھے عدالت کے احاطے میں گرفتار نہیں کر سکتے۔ مقامی حوالات کے انچارج نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے مجھے میرا سامان تھا دیا اور کہا آپ جلدی سے یہاں سے اوپر چلے جائیں اور عدالتی کمرے سے ہو کر باہر نکل جائیں۔ چنانچہ میں اوپر عدالت کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ پولیس باہر جانے والے دروازے پر کھڑی ہے (مجھے لارڈ جیفورڈ نے فیصلے سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ عدالت کے باہر سینکڑوں کی تعداد میں پولیس کھڑی ہے اور آپ کے پارٹی ممبر اور دوسرے ہمدرد بھی سینکڑوں کی تعداد میں ہیں) دروازے پر پولیس آفیسر نے مجھے ہوم سیکرٹری کا حکم نامہ تھمانے کی کوشش کی تو میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر دوسرے افسر نے حکمنامہ میری جیب میں ٹھونسا تو میں نے اسے نیچے پھینک کر پیر سے مسل دیا اور پولیس افسروں سے کہا کہ وہ مجھے عدالت کے کمرے میں گرفتار نہیں کر سکتے۔ اسی دوران مسٹر ڈارٹس وہاں پہنچا اور اس نے کہا آپ کے باہر نکلنے کی صورت میں نقص امن کا خطرہ ہے اس لئے ہم نے پہلے ہی آپ کو عدالت کے کمرے میں ہی گرفتار کرنے کی اجازت حاصل کی ہے۔ اگر آپ نے گرفتاری نہیں دی تو ہمیں جبر سے کام لینا پڑے گا۔ جو کم از کم میں نہیں چاہتا کیوں کہ میرے دل میں آپ کے لئے بڑا احترام ہے۔ اتنے میں کہیں سے مس کر بچن بھی ہانپتی کانپتی وہاں پہنچ گئی اور اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں حکم نامہ وصول کروں اور گرفتاری دے دوں۔ چنانچہ میں نے حکمنامہ وصول کیا۔ اسے پڑھا اور اس کی نقل پر اصل کاپی وصول کرنے کی تصدیق کرتے ہوئے دستخط کر کے نقل مسٹر ڈارٹس کو لوٹا دی۔ حکمنامہ میں کہا گیا تھا کہ چونکہ مسٹر امان اللہ خان کی برطانیہ میں موجودگی برطانیہ کی قومی سلامتی کے منافی ہے اس لئے میں فلاں قانون کی فلاں دفعہ کے تحت مجھے حاصل اختیارات استعمال کرتے ہوئے مسٹر خان کی برطانوی بدر کے احکامات جاری کر رہا ہوں۔ مسٹر خان چاہیں تو میرے فیصلے کے خلاف ایک اسپیشل ٹریبونل سے اپیل کر سکتے ہیں۔ نیچے ڈوگلز ہرڈ ہوم سیکرٹری (مرکزی وزیر داخلہ) کے دستخط تھے اور حکمنامے کے اجرا کا وقت 23 ستمبر چار بج کر 23 منٹ بعد دوپہر ڈالا گیا تھا عدالت میں میری بریت کا فیصلہ چار بج کر بیس منٹ پر ہوا تھا۔ مس کر بچن کے مشورے کے تحت میں نے حکمنامے کی نقل پر بھی لکھ دیا کہ میں اس فیصلے کے خلاف ٹریبونل کے سامنے اپیل کروں گا۔

مجھے سینٹ آبنز پولیس اسٹیشن لے جا کر ایک دفتر کے کمرے میں رکھا گیا۔ میں وہاں سگریٹ پینے لگا تو مسٹر ڈارٹس نے آکر کہا۔ مسٹر خان خدا کے لئے اپنی تحریک اپنے ساتھیوں اپنی بیوی اور اپنی اکلوتی بیٹی پر رحم کریں اور سگریٹ نوشی چھوڑ دیں کیونکہ آپ ہر سگریٹ کے ساتھ اپنی زندگی کو گھٹا رہے ہیں۔ ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ لارڈ جیفورڈ اندر آئے اور مجھ سے کہنے لگے آپ کی ملک بدری کا حکمنامہ اور اسے جاری کرنے کا طریقہ ایک بہت بڑا فراڈ ہے میں اس

کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ کروں گا (لارڈ جیفورڈ نے چند دن بعد یہ رٹ کی لیکن ہائی کورٹ نے یہ موقف اختیار کرتے ہوئے کہ قومی مفاد اور قومی سلامتی سے متعلق معاملات میں قانون اور ضابطوں کے ہر لفظ پر عمل کرنا ضروری نہیں اور وزیر داخلہ ایسے معاملات میں عام ضابطوں سے انحراف کرنے کا مجاز ہے۔ رٹ رد کردی۔)

لارڈ جیفورڈ کے چلے جانے کے بعد میں نے باہر شور مٹا۔ معلوم ہوا مس کریمین مجھ سے ملنا چاہتی ہیں لیکن پولیس والے اس کو اجازت نہیں دے رہے اس لئے وہ چلا رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مس کریمین اندر آنے میں کامیاب ہو گئی اور آتے ہی پھر رونے لگی کہ ہم آپ کو بچانے میں ناکام ہو گئے۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور خاموش کرا دیا۔ اس کے بعد وہ جیل آکر ملنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ مس کریمین ایک آزادی پسند، انتہائی مخلص اور جذباتی خاتون ہیں۔

شام کو مجھے بھاری گارد میں لیوٹن پولیس اسٹیشن لے جایا گیا اور دوسری صبح بیڈ فورڈ جیل۔ وہاں مجھے دوسرا جیل نمبر (N 43373) الاٹ کیا گیا دو تین دن بعد مجھے دوبارہ برکسٹن جیل منتقل کیا گیا۔ بیڈ فورڈ جیل کے قیدی اور افسر میری ایک جھلک دیکھنے میرے سیل کے سامنے سے گزرتے۔ اسی دوران لیوٹن کے کشمیریوں پاکستانیوں اور لیبر پارٹی کے ممبروں نے میری برطانیہ بدری کے احکامات کے خلاف ایک زبردست احتجاجی مظاہرہ بھی کیا۔ اس سے قبل لندن میں ہوم آفس کے سامنے بھی ایک تاریخی مظاہرہ ہوا تھا۔

اب کے برکسٹن جیل میں مجھے اے A کیٹگری کی بجائے عام قیدی کے طور پر رکھا گیا۔ لیکن پابندیاں اور کچھ سہولتیں اے کیٹگری کی جاری رہیں۔ میرے کیس کی سماعت کے دوران بیڈ فورڈ ریڈیو اور لندن لوکل ریڈیو میرے کیس کی خبریں مسلسل دیتے رہے۔ ہائی کورٹ کی رٹ اپیل کی بھی ریڈیو اور اخباروں میں بڑی تشہیر ہوئی۔ یکم دسمبر کو لندن کے مشہور روزنامہ گارڈین نے تو میری برطانیہ بدری کے احکامات کے خلاف ایک زور دار اداریہ بھی لکھا۔ لندن کے اردو اخبارات جنگ اور وطن، ہفت روزہ اخبار وطن میرے کیس کی خبریں کئی کئی کالموں میں شائع کرتے رہے۔ میں جیل میں ریڈیو بھی سنتا تھا اور اخبارات بھی منگواتا تھا۔ بی بی سی اردو سروس لندن میں سنائی نہیں دیتی۔ بعد میں کراچی پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ بی بی سی اردو سروس بھی میرے بارے میں خبریں اور تبصرے مسلسل نشر کرتی رہی تھی۔

13 نومبر کو میں ٹریبونل کے سامنے پیش ہوا۔ یہ ٹریبونل ہاؤس آف لارڈز کے دو ممبروں اور امیگریشن سے متعلق ایک اہم شخصیت پر مشتمل تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر ٹریبونل برطانیہ بدری کے احکامات واپس لینے کی سفارش کرے بھی تو ہوم سیکریٹری اس سفارش پر عمل کرنے کا پابند نہیں۔ اس کے باوجود میں ٹریبونل کے سامنے اس لئے پیش ہوا کہ برطانوی سوسائٹی کے ان

اہم افراد کو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر سے متعلق حقائق سے آگاہ کروں۔ ٹریبونل کے سامنے وکیل کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ مس کریمین باہر انتظار کرتی رہیں اور میں راجہ ظفر خان کو ساتھ لے کر ٹریبونل کے سامنے پیش ہوا۔ میری اس پیشی کے دوران بھی باہر سڑک پر لبریشن فرنٹ کے ممبر اور دوسرے کشمیری ایک بڑی تعداد میں میری برطانیہ بدری کے احکامات کے خلاف مظاہرہ کرتے رہے۔

میں دو گھنٹے تک ٹریبونل کے سامنے بولتا رہا۔ وہ کیس کے بارے میں پوچھتے رہے اور میں ان کے سوالوں کے مختصر جواب دینے کے بعد مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کے بارے میں بتاتا رہا۔ میں نے ان پر واضح کیا کہ کشمیری گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے جن مصائب کا شکار ہیں ان کی سب سے بڑی ذمہ داری برطانیہ والوں پر عاید ہوتی ہے۔ برطانیہ نے 1846ء میں کشمیرپوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح پچھتر لاکھ روپے میں گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچا جو اور جس کے جانشین پوری ایک صدی تک ہمیں پیستے رہے۔ اس کے بعد 1947ء میں لارڈ مونٹ بیٹن اور ہاؤنڈری کمیشن کے چیئرمین ریڈ کلف نے ہمیں بھارت کی غلامی میں دینے میں اہم کردار ادا کیا اور اب بھارت کو خوش کرنے اور اس کے ہاتھ اپنے ہیلی کاپٹر بیچنے کے لئے آپ کی حکومت مجھے برطانیہ بدر کر کے تحریک آزادی کشمیر پر ایک اور وار کر رہی ہے۔ ٹریبونل کے ممبران میری باتوں اور میری پیش کردہ دستاویزات کو بغور سنتے اور دیکھتے رہے۔ بہر حال مجھے یقین تھا کہ ان لوگوں کے میری باتوں سے متاثر ہونے کے باوجود ہوم سیکرٹری اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مجھے نومبر کے اواخر میں ہوم آفس نے اطلاع دی کہ ہوم سیکرٹری کا فیصلہ قائم ہے اور میری برطانیہ بدری دسمبر کے وسط میں عمل میں آئے گی۔

وسط نومبر کے بعد مجھ سے ملاقات کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک دن میں (دو افراد سے) ایک ہی ملاقات ہو سکتی تھی۔ چنانچہ احباب دور دور سے آکر ناکام لوٹتے تھے۔ جو لوگ ملاقات کرتے رخصت ہوتے ہوئے لپٹ کر روتے۔ ناننگم کے لالہ عبدالرحمن ملتے ہی (اپنی پیرانہ سالی کے باوجود) لپٹ کر بچوں کی طرح روتے رہے اور کہتے رہے اب تحریک کا کیا ہو گا۔ میں نے کہا لالہ تحریکیں افراد پر انحصار نہیں کرتیں۔ انشاء اللہ تحریک یہاں بھی زندہ رہے گی۔ اپنی وکیل مس کریمین سے میری آخری ملاقات کا منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا۔

مجھے 15 دسمبر کی شام کو کہا گیا کہ میں دوسری صبح سویرے جیل سے رخصت ہونے کے لئے تیار رہوں اور 16 دسمبر کو صبح سویرے ہی بہت ساری رسمی کاغذی کارروائی کے بعد دو پولیس گاڑیوں کی گارد میں ایئرپورٹ کی طرف لے جایا گیا۔ اپنے ونگ سے رخصت ہوتے وقت قیدی اپنی کھڑکیوں سے مجھے الوداع کہتے رہے۔ مسٹر فلپسن سمیت قیدیوں سے میں ان کی سیل کی کھڑکی پر جا کر ملا۔ فلپسن میرا بڑا ہمدرد تھا۔

جیل سے نکلنے ہی میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھے ہوئے پولیس افسر نے خاصی کڑکھائی سے کہا۔ مسٹر خان اگر راستے میں آپ نے یا آپ کے حامیوں نے کوئی گڑبڑ کی تو آپ کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ میں نے کہا مجھے معلوم ہے لیکن میں آپ کے لہجے اور طرز تکلم کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔ اس پر میری دوسری طرف بیٹھے ہوئے افسر نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو یہ وارننگ دینا ہمارے فرض میں شامل ہے۔ بہر حال کڑکھائی کے لئے معافی مانگتا ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ملک لطیف اور ظفر خان لیوٹننٹ سے آپ کا ذاتی سامان لے کر آ رہے ہیں اور ایئرپورٹ پر آپ سے وہی دو ملاقات کر سکیں گے کسی اور کو اجازت نہیں۔ میں دوران سفر لندن پر آخری نظر ڈالتا رہا۔ آخر ہم ایئرپورٹ پہنچے تو مجھ سے کڑکھائی کے لہجے میں بات کرنے والا افسر ملک لطیف اور ظفر صاحب کو ڈھونڈنے نکلا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ عظمت خان پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر دوڑ رہا ہے۔ میں نے اپنے ساتھ والے افسر سے کہا وہ نوجوان مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔ مہربانی کر کے اسے یہاں بلائیں۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے دوسری گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایک افسر کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ عظمت خان کو بلا لائے۔ عظمت خان نے مجھے دیکھتے ہی کہا امان صاحب اندر بہت لوگ جمع ہیں اور آپ کو نہ پا کر پریشان ہیں میں ان کو یہاں بلاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف بھاگا اور تھوڑی دیر میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد میرے حق میں اور میری برطانیہ بدری کے خلاف فلک شگاف نعرے لگاتی ہوئی وہاں پہنچی۔ ہر ایک مجھ سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ گاڑی سے باہر نکل کر ان سبوں سے ملوں اور ان سے چند باتیں کروں لیکن پولیس نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اتنے میں ملک لطیف اور ظفر خان کی تلاش میں جانے والا افسر نعرے اور شور سن کر دوڑتا ہوا واپس آیا اور آتے ہی لوگوں کو منتشر ہونے کے لئے کہا تو کچھ لوگوں خاص کر برمنگھم کے راجہ حبیب خان نے نعرے بازی شروع کی تو پولیس افسر گاڑی میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو گاڑی آگے لے جانے کے لئے کہا چنانچہ ڈرائیور پوری رفتار سے گاڑی وہاں سے دو تین فرلانگ دور عمارت کے عقب میں لے گیا جہاں لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس طرح سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے مجھے الوداع کہنے لندن ایئرپورٹ آنے والے احباب سے میں اچھی طرح رخصت بھی نہ ہو سکا۔

پولیس گاڑی ایک جہاز کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ سینئر افسر پھر ملک لطیف اور ظفر صاحب کی تلاش میں نکلا۔ اتنے میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹی وی والے بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ میرا انٹرویو کرنا چاہتے تھے لیکن پولیس نے اس کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ وہ کیمرے لے کر ذرا دور کھڑے ہو گئے پولیس نے گاڑی کے شیشے چڑھا دیئے لیکن ٹی وی والوں نے فلڈ لائٹ (Flood-light) ڈال کر میری تصویریں لیں۔ میں نے گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے (v) کے نشان بنائے۔ آدھے گھنٹے کے بعد مجھے گاڑی سے باہر لایا گیا اور ساتھ کھڑے برٹش

ایئریوز کے جہاز پر سیڑھی لگا کر مجھے اوپر لے جایا گیا۔ پولیس کوشش کرتی رہی کہ میں ٹی وی کیمرے کی زد میں نہ آؤں لیکن میں نے سیڑھیاں چڑھتے ایک طرف ہو کر پھر وکٹری (v) کا نشان بنایا۔ ٹی وی والوں نے سیڑھیاں چڑھنے کا منظر پورا فلمایا (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ منظر اسی شام لندن ٹی وی کی مقامی خبروں میں میری برطانیہ بدری کی خبر کے ساتھ دکھایا گیا)

میں جب اوپر جہاز میں پہنچا تو جہاز ابھی خالی تھا۔ مجھے لے جا کر آخری قطار میں درمیان والی نشست پر بٹھایا گیا اور دو پولیس آفیسر میری دونوں طرف بیٹھ گئے۔ اتنے میں سینئر افسر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ میرا سامان پہنچ گیا۔ دراصل راستے میں ٹریفک جام کی وجہ سے ملک لطیف وغیرہ کی دو گاڑیاں جن میں لیوٹن کے میرے دوست سوار تھے، دیر سے پہنچیں۔

جہاز روانہ ہوا اور میں نے لندن پر آخری نظر ڈالی۔ جہاز میں بہت سے پاکستانی بھی سوار تھے۔ کسی طرح انھیں معلوم ہوا تھا کہ میں اس جہاز سے سفر کر رہا ہوں۔ مجھے دو پولیس افسروں کے درمیان بیٹھے دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ میں ہی امان اللہ ہوں۔ چنانچہ بہتوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی لیکن پولیس والوں نے بجز دو اصحاب کے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دی۔

کراچی پہنچنے سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ قبل جہاز کا چیف سیکورٹی افسر میرے ساتھ والے سینئر افسر کو بلا کر ذرا دور لے گیا اور دونوں میں کچھ کھسر پھسر ہونے لگی جس کے بعد دونوں کاک پٹ کی طرف چلے گئے۔ پولیس والا خاصی دیر کے بعد واپس آیا میں نے پوچھا کوئی خاص بات ہے کہنے لگا کوئی خاص بات تو نہیں۔ ہم حکومت پاکستان کو آگاہ کرنے گئے تھے کہ ہم تمہیں کراچی لا رہے ہیں تاکہ اگر یہاں تمہارے خلاف کوئی کیس ہے تو یہاں کی پولیس تمہیں ہم سے اپنی تحویل میں لے لے۔ جہاز لینڈ کرنے سے پہلے چیف سیکورٹی افسر پھر آیا اور اس نے کہا حکومت پاکستان مسٹر خان کو گرفتار نہیں کر رہی۔

کراچی انر پورٹ پر قدم رکھتے ہی برطانوی پولیس افسر نے مجھ سے کہا مسٹر خان اب آپ آزاد ہیں۔ اچھی ہم سفری کے لئے ہم آپ کے مشکور ہیں۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ساتھ کھڑی گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے دوسری کا انتظار کرتے رہے۔ میں پہلی گاڑی سے لاؤنج کی طرف آ گیا جہاں میرے عزیز محمد سلیم (جو انر پورٹ سیکورٹی فورس میں افسر ہے) چچا زاد بھائی حاجی صاحب خان اور ڈاکٹر محبوب عالم کھڑے تھے۔ اتنے میں دونوں پولیس افسر بھی وہاں پہنچے۔ میں نے اپنے عزیزوں سے ان کا تعارف کرایا دونوں کچھ پریشان اور جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ شاید ان کو ڈر تھا کہ میرے حامی انر پورٹ پر ان کی پٹائی نہ کریں۔ بہر حال وہ جلدی میں دوسری طرف چلے گئے۔ میں لاؤنج سے باہر آیا تو کراچی کے اکثر علاقوں میں کرفیو ہونے کے باوجود رات چار بجے کشمیریوں کی ایک بڑی تعداد جن میں اکثریت این ایس ایف، کے ایل ایس او، کے این ایس ایف - اسلامی جمعیت طلباء آزاد کشمیر اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے تعلق رکھنے والے

طلباء کی تھی اتر پورٹ پہنچی تھی۔ میرے باہر آتے ہی سارا اتر پورٹ نعروں سے گونج اٹھا۔ میں نے ان سے مختصر سا خطاب کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی کہ ان طلباء میں مسلم کانفرنس کے یوتھ ونگ کے سربراہ زاہد امین کاشف سمیت نظریاتی طور پر ہماری مخالف تنظیموں کے ممبروں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی جو ان لوگوں کی اعلیٰ ظرفی اور حب الوطنی کا بین ثبوت تھا۔ طلباء سے مختصر سے خطاب کے بعد میں اتر پورٹ سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

برطانیہ میں اسیری کے دوران کچھ پولیس افسروں، جیل کے کچھ افسروں اور بھارتی ڈاکٹروں کے غلط رویے۔ دوران اسیری موت کے منہ تک پہنچنے اور آخر میں برطانیہ بدر ہونے کے باوجود پندرہ ماہ دس دن کا یہ عرصہ میں نے انتہائی اطمینان سے گزارا۔ کچھ پولیس افسروں کچھ جیل افسروں لیسٹر جیل کی ڈاکٹر پیشا اور اس کے اکثر ساتھیوں، برکسن جیل کی مس کنگلے اور بہت سے افسروں - میرے وکلاء خاص کر لارڈ جیفورڈ اور مس لوکیس کر نیچن - لبریشن فرنٹ میں میرے تمام ساتھیوں، برطانیہ کے اردو اخبارات اور جرائد خاص کر جنگ، وطن، اخبار وطن، راوی اور مشرق، دوسری کشمیری تنظیموں، لبریشن لیگ، آزاد مسلم کانفرنس، آزاد کشمیر پیپلز پارٹی، مسلم کانفرنس، آزاد کشمیر جماعت اسلامی، تحریک عمل پارٹی، تحریک کشمیر، کشمیر انقلابی تحریک، جمعیت علمائے اسلام آزاد کشمیر کے علاوہ گلاسگو کی کشمیر ویلفیئر ایسوسی ایشن، کشمیر انڈیپنڈنٹ موومنٹ، کشمیر ڈیفنس کونسل، بریڈ فورڈ کے سابق لارڈ میئر محمد عجیب، آزاد کشمیر ایکشن گروپ، لیسٹر کے ایم ایچ بٹ، آزاد کشمیر کے چوہدری عبد المجید، گلاسگو کے بشیر مان اور لندن کے برگڈیز عثمان خالد، پیرسٹر صہبت قادری، رشید احمد صدیقی، ظہور بٹ اور پیرسٹر نقوی، قومی محاذ آزادی یو کے، پاکستان ورکرز ایسوسی ایشن، پاکستان کشمیر ویلفیئر ایسوسی ایشن، یوٹن، اسلامک ایسوسی ایشن، یوٹن، برٹش پاکستان لیبر پارٹی اولڈ ہم، پاکستان ایسوسی ایشن گلاسگو، یو کے اسلامک مشن لندن، لیبر ممبران پارلیمنٹ بالخصوص برمنگھم کے ٹیری ڈیویس (Terry Devis) شیڈو ہوم سیکری جیرالڈ کافمن (Gerald Kaufman) برمنگھم کے ڈینس ہاول (Denis Hawell) اولڈ ہم کے جیمز لیمنڈ (James Lemond) بریڈ فورڈ کے میکس میڈن (Max Madden) لندن کے (Eric Dickens) انٹرنیشنل (Amnesty International) نیشنل کونسل فار سول لیبرٹیز (NCCL) نیشنل یونین آف جرنلس (NUJ) بی بی سی ریڈیو، بیڈ فورڈ روزنامہ گارڈین (Guardian) لندن اور بی بی سی اردو سروس سے منسلک افراد کے علاوہ امریکہ، یورپ کے دوسرے ممالک، مشرق وسطیٰ، آزاد کشمیر اور پاکستان میں اپنے ہمدردوں اور بہت سے دوسرے افراد، روزنامہ مسلم اسلام آباد اور آزاد کشمیر کے جرائد خاص کر ولر، انصاف، قائد، کشمیر اور دیگر جرائد (جنہوں نے میرے حق میں زور دار ادائیے اور مضامین لکھے) اور میرے ان ساتھیوں جنہوں نے میرے آپریشن اور علالت کے دوران خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ میں میری صحت یابی کے

لئے دعائیں مانگیں، کی طرف سے ملنے والے مکمل تعاون، پر زور حمایت، حوصلہ افزائی اور دعاؤں کے نتیجے میں اور اس خیال سے کہ میں یہ مصائب اور اسیری اپنی زندگی کے واحد مشن یعنی قومی آزادی کے لئے برداشت کر رہا ہوں۔ مجھے پوری اسیری کے دوران مکمل اطمینان قلب اور ذہنی سکون حاصل رہا جس کے لئے میں متذکرہ بالا تمام حضرات، اداروں اور تنظیموں کا دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں ان تمام حضرات کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے میرے حق میں آواز اٹھائی لیکن مجھے اس کا پتہ نہیں چلا۔ میں لیونٹن کے حاجی منظور صاحب، ملک شفیع صاحب، ملک غلام سرور صاحب، ملک لطیف صاحب، ظفر خان صاحب، برنگھم کے چوہدری سلطان محمود صاحب، مولانا محمود احمد صاحب میرپوری مرحوم اور محمود نظامی صاحب، لندن کے ڈاکٹر ایوب شہاکر صاحب اولڈھم کے افضل جاتلوی صاحب اور چوہدری نادر حسین صاحب اور ہیلی نکس کے شبیر چوہدری صاحب اور سفارت خانہ پاکستان لندن کے جمالیگر خان جو میرے برادر نسبتی ڈاکٹر محمد لطیف خان کے برادر نسبتی ہیں اور ان میں سے اکثر کے اہل خانہ کا ازحد مشکور ہوں کہ انہوں نے میری اسیری کے دوران میری فیملی کا خیال رکھا اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ حاجی منظور خان اور بیگم منظور نے تو ان دنوں میرے سگے بھائی اور بھابی کا کروار ادا کیا۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ اس دوران میری اہلیہ بچی اور دوسری عزیزہ نے بے مثال ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کیا۔

میری ان اسیریوں سے ملنے والے کچھ اہم سبق

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مصائب و آلام کے دوران انسان زندگی کے موثر ترین سبق حاصل کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ عام طور پر لوگ ان مسائل کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ سبق بھی بھول جاتے ہیں۔

میں نے اپنی کئی بار کی قید و بند سے بے شمار سبق حاصل کئے ہیں اور ان سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ ان میں سے کچھ سبق ایسے ہیں جو تحریک آزادی یا کسی اور مقدس مشن سے منسلک افراد کے لئے انتہائی کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کچھ کا تذکرہ یہاں بھی کیا جائے تاکہ خواہشمند قارئین بھی ان سے استفادہ کر سکیں۔

1- اگر انسان کسی ارفع مقصد خاص کو حصول آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں قید و بند کے دوران ملنے والی ذہنی اور جسمانی اذیتوں کو اپنے مشن کے حصول کے لئے ضروری قربانیاں اور اپنے فرض کی ادائیگی کا حصہ تصور کرے تو یہ ذہنی اور جسمانی اذیتیں اسے ایک ایسا روح پرور اطمینان قلب اور ذہنی سکون عطا کرتی ہیں جن کا وہ عام زندگی میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہی

نہیں بلکہ یہ اذیتیں اس کے عزم و استقلال کو بھی مضبوط تر کر دیتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر انسان ان اذیتوں کو مصیبت اور بے جا ظلم تصور کرے یا کسی شخص کو اس کا ذمہ دار سمجھے تو یہ اذیتیں کئی گنا زیادہ تکلیف کا باعث بن جاتی ہیں اور انسان کے عزم پر بھی منفی اثر ڈالتی ہیں۔

2- اگر انسان چاہے تو حصول آزادی کے سلسلے میں قید و بند کے دوران فرصت کے لمحات سے مناسب استفادہ کرتے ہوئے ایسے کام کر سکتا ہے جو وہ آزاد زندگی میں دوسری مصروفیات کی وجہ سے نہیں کر سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ تاریخی نظریاتی اور ادبی لحاظ سے اعلیٰ ترین معیار کی کتابیں اور مضامین ان کے مصنفین کی اسیری کے دوران ہی لکھے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں انسان اسیری کے دوران اپنے مطالعے کو بھی وسعت دے سکتا ہے۔

3- اعلیٰ مقاصد کے سلسلے میں قید و بند انسان کی نظر کو وسعت اور گہرائی، طبیعت کو صبر اور استقلال، نظریات کو پختگی، عزم کو مزید قوت، کلام کو اثر اور مٹھاس۔ جذبہ ایثار و قربانی کو تقویت اور اس کے علم کو وسعت عطا کرتی ہے بشرطیکہ انسان اس قید و بند کو اپنے مشن کے سلسلے کے اپنے فرائض کی ادائیگی کا حصہ تصور کرے اور اس دوران وقت کا بھی صحیح استعمال کرے۔

4- اعلیٰ مقاصد کے سلسلے کی قید و بند انسان کو اہم مسائل پر ٹھنڈے دل اور دور اندیشی سے غور کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

5- یہ قید و بند انسان کو اس کے اصلی اور فطری دوستوں کی صحیح پہچان بھی کراتی ہے۔

الغرض اگر انسان چاہے تو وہ اعلیٰ مقاصد کے سلسلے کی اسیری کو بھی بدلی ہوئی رحمت (Blessing in Disguise) میں تبدیل کر سکتا ہے۔



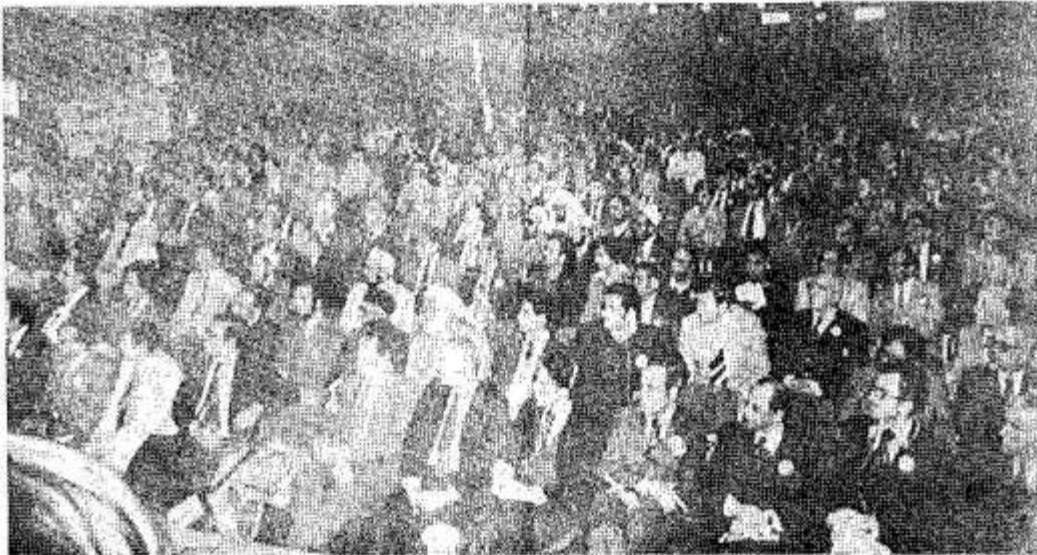




۱۹۷۹ء میں مسلم تحریک آزادی کی بین الاقوامی کانفرنس میں کشمیری وفد کی قیادت کرتے ہوئے



لندن میں مسلم تحریک آزادی کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے (اپریل ۱۹۷۹ء)



اسلامی کانفرنس کے میرے خطاب کے دوران سامعین جن کی اکثریت سفارت کاروں پر مشتمل تھی



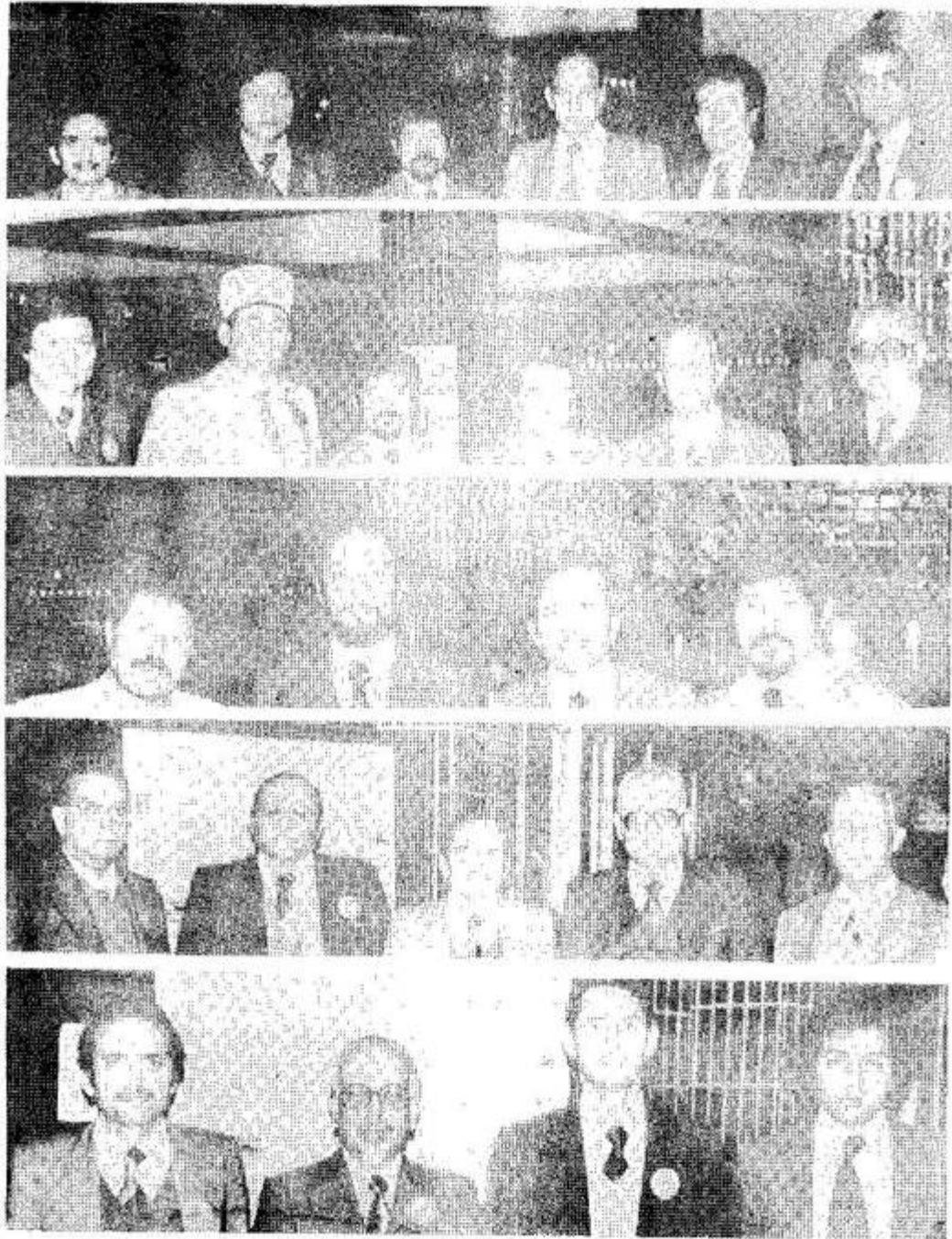
بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کی سیاسی کمیٹی کے اجلاس میں صادق الممدی کے ساتھ



اسلامی کانفرنس کے دوران لیبیا کے وفد کے قائد مفتاح ممدی کے ساتھ (1979ء)



ڈنمارک میں پریس کانفرنس سے خطاب



اسلامی کانفرنس کے وفد کے ممبروں کے ساتھ (۱۹۷۹ء)



اقوام متحدہ کے پریس روم میں مشترکہ پریس کانفرنس میں



فارن پریس کلب لندن میں پریس کانفرنس



کویت میں پریس کانفرنس سے خطاب (1985ء)

جہد مسلسل

میرے حیت پسند ساتھی



صدیق بھٹی



اورنگزیب شہید



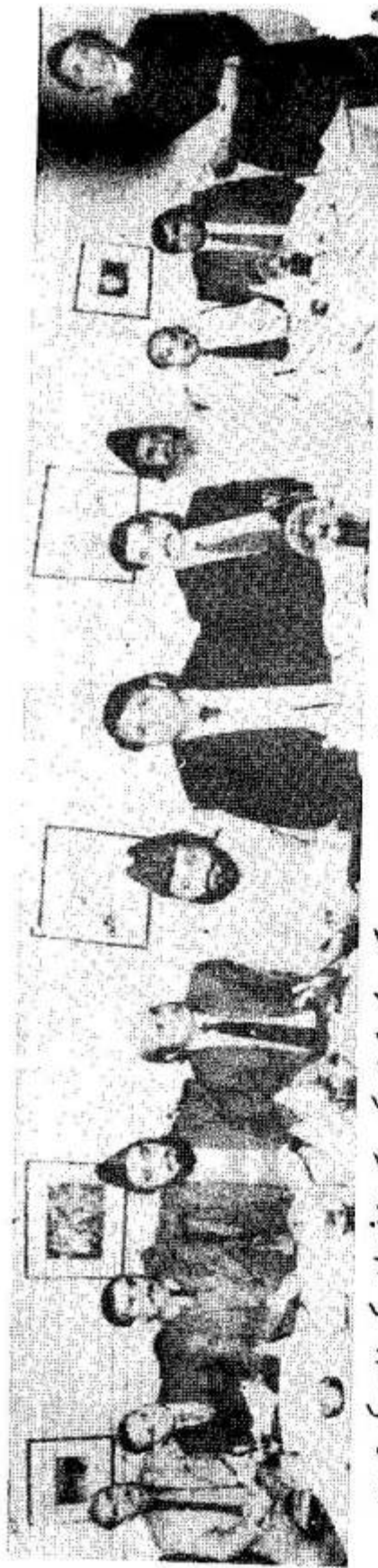
قیوم راجہ



کالا خان مرحوم



ریاض ملک



برطانیہ کی کشمیری تنظیموں کے رہنما میری برطانیہ بدری کے خلاف پریس کانفرنس سے خطاب۔ میری وکیل لوئیس کریم کے قانونی پہلوؤں کی وضاحت کر رہی ہے



بھارتی ہائی کمیشن لندن پر لبریشن فرنٹ کا مظاہرہ



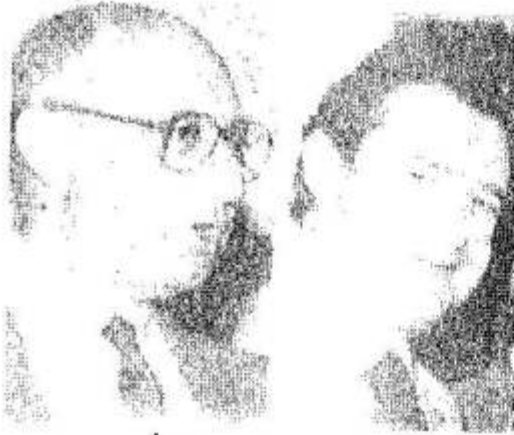
ہموں کشمیر لبریشن فرنٹ اور دوسری جماعتوں کے ارکان ہوم آفس کے سامنے امان اللہ خان کی رہائی کے لئے مظاہرہ کر رہے ہیں



برطانیہ کی عدالت میں ہیرے کیس کے فیصلے کے دوران ہیرے احباب وکیلوں کے ساتھ



جوں کشمیر لبریشن فرنٹ کے اراکین اور دوسرے کشمیری امان اللہ خان کو عدالت میں پیش کئے جانے کے موقع پر عدالت کے باہر



نیری ڈیوس --- جیرالڈ کانن



برکٹن جیل کے ہسپتال میں ملاقات کرتے ہوئے

میرے اس فونو کو مغربی اخبارات مجھے دہشت گرد کے طور پر اجاگر کرنے کے لئے استعمال کرتے رہے



برطانیہ بدری کے موقع پر لندن ایئر پورٹ پر پولیس گاڑی میں سے اپنے ہموطنوں کو الوداع

حصّہ چہارم



متفرقات



پہلا باب

میرے ذہن میں نظریہ خود مختار کشمیر کی پیدائش اور ارتقاء

دور جدید میں کسی شخص کی طرف سے کوئی نظریہ اپنائے جانے کے پس منظر میں یا تو اس کا کوئی ذاتی یا گروہی مفاد ہوتا ہے یا وہ کسی لیڈر، کسی تنظیم یا اس کے منشور سے متاثر ہو کر اس کے نظریے کو اپناتا ہے یا تیسری صورت میں تاریخی پس منظر کی روشنی میں حالات و واقعات کا مشاہدہ اس کے دل اور ذہن میں آہستہ آہستہ کسی نظریے کو جنم دیتا ہے اور ان مشاہدات کے یکساں تسلسل کیساتھ اس کے دل و دماغ میں اس نظریے کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔

پہلی صورت میں انسان کا نظریہ اسکے مفادات کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور وہ شخص سیاسی فضا کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سیاسی پینترے بدلتا رہتا ہے یعنی آج ایک نظریے کا حامل اور ایک پارٹی میں تو کل دوسرے نظریے کا حامل اور دوسری پارٹی میں۔ ایسے لوگوں کو سیاسی زبان میں لوٹے، سیاسی مسافر، فصلی بیڑے یا چڑھتے سورج کے پجاری کہا جاتا ہے۔ دوسری صورت گو پہلی صورت کی نسبت دیرپا ہوتی ہے لیکن اس کے مستقل طور پر قائم رہنے کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوتی جس شخص یا تنظیم سے وہ متاثر ہوتا ہے اس کے منظر سے ہٹنے کے ساتھ ہی عام طور پر اس شخص میں بھی ذہنی اور نظریاتی تبدیلی آ جاتی ہے۔

تیسری طرز سے اپنائے جانے والا نظریہ انسان کی سوچ کا ضروری جز بن جاتا ہے اور کوئی بڑا انقلابی واقعہ یا حالات میں کوئی انقلابی تبدیلی ہی اس نظریے کو اس کے دل سے نکال سکتی ہے۔

پوری ریاست جموں کشمیر کی مکمل خود مختاری کا نظریہ میرے ذہن میں نہ تو کسی ذاتی یا گروہی مفاد کے نتیجے میں پیدا ہوا نہ ہی کسی شخص یا تنظیم سے متاثر ہو کر بلکہ جوں جوں میں مسئلہ کشمیر سے متعلق حقائق اور حالات و واقعات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتا گیا میرے ذہن میں یہ نظریہ غیر شعوری طور پر پیدا ہو کر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

جب تک میں مقبوضہ کشمیر میں تھا وہاں کے محدود اور مخصوص ماحول کے نتیجے میں پوری ریاست جموں کشمیر کے پاکستان سے الحاق کو مسئلہ کشمیر کا بہترین حل تصور کرتا تھا۔ اس سلسلے میں

میں نے مقدور بھر کام بھی کیا۔ پاکستان آکر پہلے دو سال تو ذاتی مسائل میں الجھا رہا۔ اس کے بعد 1954-55ء میں کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن کراچی کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے سرگرم ہو گیا اور مسئلہ کشمیر سے متعلق تاریخی حقائق اور حالات و واقعات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتا رہا۔ 1957ء تک میرے ذہن میں خاصی تبدیلی آئی تھی اور میں خود مختار کشمیر کو مسئلہ کشمیر کے چند حلوں میں سے ایک سمجھنے لگا تھا لیکن 1961ء تک خود مختار کشمیر کا نظریہ میرے ذہن میں پوری طرح جڑیں پکڑ چکا تھا۔ اس دوران کراچی کے کشمیری سیاسی کارکنوں کے ساتھ تعلقات پیدا ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سے اصحاب خاص کر جی ایم لون مرحوم میرے ہم خیال ہیں۔ چنانچہ ہم نے اپنا ایک گروپ بنایا جو ابتداً ”کراچی تک محدود تھا لیکن 1963ء میں اس کو وسعت ملی اور وہ آزاد کشمیر و پاکستان سطح پر کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی کی شکل میں، 1965ء میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری کی شکل میں اور 1977ء میں بین الاقوامی سطح پر جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی شکل میں منظم ہو گیا۔ اس طرح خود مختار کشمیر کا جو نظریہ میرے ذہن میں 1955ء میں مسئلہ کشمیر کے ایک متبادل حل کی شکل میں داخل ہوا تھا۔ وہ وقت گزرنے اور میرے مطالعے اور مشاہدے میں وسعت اور گہرائی آنے کے ساتھ ساتھ میرے سیاسی ایمان کا بنیادی ستون اور میری فکر کا جزو لاینفک بن گیا۔

میرا نظریہ خود مختار کشمیر ناقابل تردید تاریخی، جغرافیائی، اقتصادی اور سماجی حقائق اور دوسرے ٹھوس دلائل پر مبنی ہے جن کی تفصیلی وضاحت میں نے اس موضوع پر لکھے ہوئے اپنے دو کتابچوں ”نظریہ خود مختار کشمیر“ اور ”خود مختار کشمیر کیوں“ میں کی ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنے کتابچے ”خود مختار کشمیر کیوں“ میں واضح کیا ہے آزاد خود مختار ریاست جموں کشمیر کوئی خیالی جنت ہوگی اور نہ ہی اس میں دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی۔ اس کے برعکس اس کے اپنے سیاسی، اقتصادی، علاقائی، دفاعی اور بین الاقوامی مسائل ہوں گے لیکن ان مسائل کے باوجود آزاد خود مختار کشمیر ریاست کے بھارت یا پاکستان کا حصہ بننے کی نسبت قومی زندگی کے ہر میدان میں کہیں زیادہ بہتر پوزیشن میں ہو گا۔



دوسرا باب

میری تصانیف اور تحریریں

میں نے اب تک مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر اردو اور انگریزی میں تقریباً ایک درجن کتابچے اور ایک کتاب لکھی ہے۔ ماہنامہ وائس آف کشمیر کراچی اور وائس آف کشمیر انٹرنیشنل برطانیہ میں ان موضوعات پر سینکڑوں مضامین اور ادارے لکھے ہیں اس کے علاوہ آزاد کشمیر، پاکستان، بھارت، عرب ممالک، یورپی ممالک اور امریکہ کے اخبارات اور رسائل میں میرے سینکڑوں مضامین، انٹرویو، بیانات اور خطوط شائع ہوئے ہیں۔ آئیے میری ان تصانیف اور دوسری تحریروں کے بارے میں ذرا تفصیل میں جائیں۔

کتابچے اور کتاب

1- ہمارے نظریات

یہ کتابچہ میں نے 1968ء میں لکھا۔ اس میں سوال و جواب کی شکل میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری (جس کا میں اس وقت سیکرٹری جنرل تھا) کے نظریات کی وضاحت کی گئی ہے۔

2 - ایف ایل این - الفتح اور کشمیری نوجوان

1969ء میں لکھا گیا میرا یہ کتابچہ انتہائی جذباتی انداز میں الجزائر کی قومی تحریک آزادی میں اہم ترین کردار ادا کرنے والی تنظیم ایف ایل این (قومی محاذ آزادی) اور فلسطین کے حریت پسندوں کی تنظیم الفتح کے بے مثال کارنامے بیان کرتے ہوئے ان کی روشنی میں کشمیری نوجوانوں کو تحریک آزادی کشمیر کے سلسلے میں ان کے فرائض یاد دلاتا ہے۔ 48 صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ کشمیری نوجوانوں میں جذبہ آزادی پیدا کرنے کے علاوہ مقبوضہ کشمیر کی اسمبلی میں بھی گرما گرم

بحث کا موضوع بن گیا۔ یہ کتابچہ پڑھ کر ہی پاکستان کی سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس یعقوب علی خان اور پاکستان کی سپریم کورٹ کے موجودہ جج عبدالقادر شیخ نے گنگا ہائی جیکنگ کیس کے فیصلے میں لکھا تھا کہ امان اللہ خان کی تحریریں انتہائی متاثر کن اور جذبات انگیز ہوتی ہیں۔ میر عبدالقیوم صاحب کی درخواست پر اس کتابچے کی کتابت روزنامہ مشرق کراچی کے کاتبوں اور طباعت روزنامہ جنگ کراچی کے جاوید پریس کے مینجر منظور خان لون صاحب نے بغیر اجرت کے کی۔ اب تک کتابچے کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

3- فری کشمیر (FREE KASHMIR)

1970ء میں انگریزی زبان میں لکھی گئی 224 صفحات پر مشتمل میری یہ کتاب نظریہ خود مختار کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے اور اس موضوع پر غالباً یہ پہلی جامع کتاب ہے۔ اس کی طباعت (پرنٹنگ) کے سلسلے میں مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے اور کتنا مالی خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ یہ ایک طویل، تکلیف دہ اور دلچسپ کہانی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ایف ایل این، الفتح اور کشمیری نوجوان، میرے جذبات اور فری کشمیر میرے نظریات کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں تو بے جا نہ ہو گا۔

4- دستاویز غلامی

1972ء میں محاذ رائے شماری کے چیئرمین پبلیٹی بورڈ کی حیثیت سے میری طرف سے شائع ہونے والے اس کتابچے میں آزاد کشمیر ایکٹ 1970ء پر مدلل تنقید کرتے ہوئے اسے دستاویز غلامی ثابت کیا گیا ہے۔

5- اقبال جرم

یہ کتابچہ دسمبر 1970ء میں گلگت کی عدالت میں پیش کئے گئے طویل تحریری بیان اور پولیٹکل ایجنٹ گلگت کے نام میرے تفصیلی خط پر مشتمل ہے چونکہ میں نے بیان میں اپنے خلاف لگائے جانے والے تمام الزامات کا اقرار کیا تھا۔ اس لئے کتابچے کا نام ہی اقبال جرم رکھا۔ میرا یہ بیان اور پولیٹکل ایجنٹ کے نام میرا خط گلگت بلتستان کی اس وقت کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی صورت حال کی پوری عکاسی کرتے ہیں۔

6- نیادام لائے.....

یہ کتابچہ 1972ء میں محاذ رائے شماری کی طرف سے شائع کیا گیا۔ اس میں آزاد کشمیر کے لیڈروں خاص کر سردار عبدالقیوم خان کے سیاسی پینتروں کی تفصیلات درج ہیں۔

7- عالمی ضمیر کے نام (TO WORLD CONSCIENCE)

1977ء میں برطانیہ میں انگریزی میں لکھے ہوئے میرے اس کتابچے (بروشر) کا ایک ایڈیشن این ایل ایف کی طرف سے اور دوسرا محاذ رائے شماری کی طرف سے شائع ہوا۔ اس میں مسئلہ کشمیر کے پس منظر، مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارت، پاکستان اور اقوام متحدہ کے کردار، اور مسئلہ کشمیر کی اصل نوعیت کے بارے میں تفصیلات کے علاوہ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کے بارے میں عالمی ضمیر کے اخلاقی فرض سے متعلق معاملات درج ہیں۔ یہ کتابچہ لندن اور اقوام متحدہ میں دنیا بھر کے سفارتخانوں اور بین الاقوامی تنظیموں کے علاوہ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کو بھیجا گیا۔

8- کشمیر کی المناک کہانی

(THE TRAGIC STORY OF KASHMIR)

1979ء میں انگریزی زبان میں میرے لکھے ہوئے اور لبریشن فرنٹ کی طرف سے شائع کئے گئے ہیں صفحوں پر مشتمل اس کتابچے میں کشمیر کی سیاسی تاریخ اور جغرافیہ، تحریک آزادی کشمیر کی تاریخ، مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارت اور پاکستان کے مواقف، مسئلہ کشمیر کی اصل نوعیت، مسئلہ کشمیر اور اقوام متحدہ، مسئلہ کشمیر کو بھارت اور پاکستان کے مابین مذاکرات کے ذریعہ حل کرنے کی کوششوں، مسئلہ کشمیر پر بین الاقوامی تعلقات خاص کر سوپر پاور سیاسیات کے اثرات، مسئلہ کشمیر کے انسانی پہلو اور دیگر معاملات کی تفصیلات درج ہیں۔ اس کتابچے کے تین ایڈیشن شائع ہو کر دنیا بھر میں تقسیم ہو چکے ہیں۔

9- نظریہ خود مختار کشمیر

1983ء میں اردو زبان میں اور سوال و جواب کی صورت میں میرا لکھا ہوا یہ کتابچہ خود مختار کشمیر کے نظریے کے بارے میں کئے جانے والے بیس اعتراضات کے مفصل اور مدلل جوابوں پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن لبریشن فرنٹ کی دی ہیگ (ہالینڈ) شاخ کی طرف سے اور دوسرا نیشنل زون (آزاد کشمیر و پاکستان زون) کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اس کتابچے کی اب تک چھ ہزار کاپیاں تقسیم ہو چکی ہیں۔

10- شہید کشمیر مقبول بٹ

یہ کتابچہ میں نے 1985ء کے وسط میں برطانیہ میں لکھا تھا۔ لیکن اس کی طباعت سے پہلے ہی گرفتار ہو گیا۔ چنانچہ اس کی طباعت برطانیہ میں میری پندرہ ماہ کی اسیری اور برطانیہ بدری کے بعد ہی ممکن ہو سکی۔ یہ کتابچہ مقبول بٹ شہید کی شخصیت اور ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلات پر مشتمل ہے۔

11- خود مختار کشمیر کیوں؟

اردو زبان میں 72 صفحات پر محیط یہ کتابچہ میں نے لیسٹر (برطانیہ) کے ہائی سیکورٹی جیل میں ستمبر اور اکتوبر 1985ء میں بیس دن میں لکھا اور اسے 1986ء میں لبریشن فرنٹ نے ماہنامہ حکایت لاہور کے پریس سے چھپوایا۔ یہ کتابچہ پوری ریاست جموں کشمیر کی مکمل خود مختاری کے حق میں تاریخی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور دیگر حقائق پر مبنی دلائل پر مشتمل ہے۔ اس کتابچے کے اب تک دو ایڈیشن شائع ہو کر تقسیم ہو چکے ہیں۔

مضامین اور انٹرویو

گذشتہ تیس سال کے دوران مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر اردو اور انگریزی میں میرے سینکڑوں مضامین - انٹرویو اور خط (معہ کھلے خط) آزاد کشمیر، بھارتی مقبوضہ کشمیر، پاکستان، بھارت، عرب ممالک، یورپی ممالک (خاص کر برطانیہ) امریکہ اور جاپان کے روزناموں اور رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ آزاد کشمیر کے جن ہفت روزوں میں میرے بہت سے مضمون

شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سرفہرست ہفت روزے انصاف - ولر - قائد - کشمیر اور بے باک ہیں پاکستان کے صف اول کے اردو اخبارات جنگ اور نوائے وقت میں اب تک میرے درجنوں مضامین اور انٹرویوز کے علاوہ جنگ فورم اور نوائے وقت کے ایوان وقت میں لئے گئے انٹرویو بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان دو اخبارات کے علاوہ ڈان، مارننگ نیوز، جسارت، پاکستان ٹائمز، حریت، پکار، مسلم، حیدر، ہفت روزہ حرمت میں بھی میرے مضامین اور انٹرویو شائع ہوتے رہے۔ بھارتی اخبارات میں سے الشریٹڈ ویلی، ہندوستان ٹائمز، ٹائمز آف انڈیا، انڈین ایکسپریس، دی ٹیلیگراف، دی سن، بلٹز اور ریڈینس میں میرے مضامین یا انٹرویو شائع ہوئے۔ سعودی عرب کے روزنامہ المدینہ اور کویت کے جرائد المجتمع اور ابلاغ میں میرے مضامین اور انٹرویو شائع ہوئے ڈنمارک کے مشہور روزنامے میں میرا طویل انٹرویو شائع ہوا۔ برطانیہ کے مشہور اخبارات دی ٹائمز، گارڈین اور روزنامہ نیوز لائن کے علاوہ جنگ - وطن - ملت - اخبار وطن - مشرق اور راوی میں میرے مضامین اور خطوط شائع ہوتے رہے۔ امریکی مسلمانوں کے اخبار دی بلالین نیوز میں میرے دو مضامین قسط وار شائع ہوئے۔ ان مضامین کے علاوہ ماہنامہ وائس آف کشمیر کراچی (1962ء تا 1964ء) اور وائس آف کشمیر انٹرنیشنل برمنگھم (1976ء تا 1984ء) کے ادارے اور ان میں شائع ہونے والے اکثر مضامین اور مزاحیہ کالم میرے ہی لکھے ہوتے تھے۔ میرے ریڈیو اور ٹی وی انٹرویوز کی تفصیلات لبریشن فرنٹ سے متعلق باب میں درج ہیں۔

درج بالا حقائق کی روشنی میں یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو گا کہ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر سے متعلق معاملات پر جتنے کتابچے کتابیں اور مضامین میں نے لکھے ہیں اتنے جدوجہد آزادی میں عملاً اور مسلسل مصروف کسی دوسرے کشمیری نے نہیں لکھے۔

میں نے کچھ مضامین دیگر موضوعات پر بھی لکھے۔ پہلا مضمون ”عالم اسلام کے مسائل اور ان کا حل“ کے عنوان سے تھا۔ اس میں میں نے عالم اسلام کے مسائل اور اسلامی دنیا کی موجودہ قابل رحم حالت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے (اقوام متحدہ اور اس سے متعلق عالمی اداروں سے حاصل کئے گئے) اعداد و شمار کی مدد سے ثابت کیا کہ اگر عالم اسلام اپنی افرادی قوت، قدرتی وسائل (زراعت - تیل - معدنیات وغیرہ) دنیا بھر میں بکھرے ہوئے مسلمان سائنسدانوں - زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق فنی ماہرین، عالمی سطح پر مشہور جنگجو مسلم قومیتوں اور اقوام متحدہ میں ممبر مسلم ممالک کی بھاری تعداد کو منظم طریقے سے استعمال کرے اور مسلم ممالک کے حکمران باہمی اختلافات ختم کر کے متحد ہو جائیں تو عالم اسلام یقیناً مغربی اور مشرقی (کیونست) بلاکوں کے ہم پلہ دنیا کا تیسرا انتہائی طاقت ور بلاک بن سکتا ہے۔ میں نے مضمون میں اس عظیم مقصد کے حصول کا ایک قابل عمل طریقہ کار بھی وضع کیا تھا۔ بڑے سائز کے اکیس ٹائپ شدہ صفحات پر محیط اس مضمون کی ہزاروں کاپیاں مسلم ممالک کے وزرائے

خارجہ، لندن اور نیویارک میں مسلم سفارت خانوں بین الاقوامی مسلم تنظیموں، مسلمان ملکوں کے اہم اخبارات جرائد کو بھیجنے کے علاوہ لندن میں 1980ء میں پندرہویں صدی ہجری کی ابتداء سے متعلق ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں بھی تقسیم کرائیں۔ اس مضمون کو بہت سے اخبارات نے قسطوں میں شائع کیا۔ مسلم ممالک کے بہت سے سکالرز کی طرف سے مجھے بہت سے ستائشی خط ملے۔

میرا دوسرا مضمون بھارتی حکومت کی مسلم دشمنی سے متعلق تھا اور میں نے خاصی ریسرچ کر کے اور کچھ چونکا دینے والے حقائق کے ذریعہ ثابت کیا تھا کہ بھارتی حکومت عالم اسلام اور مسلمانوں کی بدترین دشمن ہے۔ اس طویل مضمون کی ہزاروں کاپیاں دنیا بھر میں تقسیم ہوئیں جس پر کچھ بھارتی اخبارات بھی چیخ اٹھے۔

الغرض قدرت نے مجھے جو قلمی صلاحیتیں عطا کی ہیں میں انہیں تحریک آزادی کشمیر اور دیگر متعلقہ معاملات پر صرف کرنے کے قومی فرض کی ادائیگی میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔ اسکا فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں۔



تیسرا باب

میرے ذہن کی کچھ اہم اختراعات

اس حقیقت کو اتفاق کہا جائے یا کچھ اور، کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن، جموں کشمیر محاذ رائے شماری، کشمیر کمیٹی برائے افریشیائی عوامی اتحاد اور این ایل ایف سے لے کر جموں کشمیر لبریشن فرنٹ تک مجھے ان تنظیموں میں کم از کم لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں تک کہ ان تنظیموں کے آئین خط و کتابت اور لٹریچر زیادہ تر میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ تقریباً یہی حال تنظیمی اور پالیسی سازی سے متعلق معاملات کا بھی رہا ہے۔ چنانچہ اپنی ان سرگرمیوں کے دوران میں نے مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کی ضروریات کے تعلق سے کچھ اصطلاحات اور نعرے خود ایجاد کئے۔ جبکہ بین الاقوامی طور پر استعمال ہونے والی کچھ اصطلاحات کو پہلی بار مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کے بارے میں استعمال کیا۔ آئیے ان میں سے چند ایک پر نظر ڈالیں۔

غیر محدود، غیر مشروط رائے شماری

1947ء میں مسئلہ کشمیر کے پیدا ہونے کے تقریباً دو عشرے بعد تک کشمیر میں اقوام متحدہ کی نگرانی میں رائے شماری کے مطالبے کو ہی مسئلہ کشمیر کے بارے میں مرکزی حیثیت حاصل تھی لیکن اس حقیقت کا علم بہت کم لوگوں کو تھا کہ اقوام متحدہ کی جن قراردادوں کے تحت یہ رائے شماری ہونی تھی ان میں سے آخری یعنی 5 جنوری 1949ء کی قرارداد کشمیریوں کے حق کو ریاست کے بھارت یا پاکستان سے الحاق تک ہی محدود کرتی ہے اور جب بھی پاکستان کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی بات کرتا اس کا مطلب یہی محدود رائے شماری ہوتا تھا۔ حالانکہ قوموں کے حق خود ارادیت کی بین الاقوامی طور پر کی جانے والی تشریح کے مطابق کسی قوم کے حق خود ارادیت کو نہ تو محدود کیا جاسکتا ہے نہ ہی مشروط اور نہ اس کے گرد کوئی دیوار کھڑی کی جاسکتی ہے۔ ہم پوری ریاست کی مکمل خود مختاری کو بھی مجوزہ رائے شماری میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں

اس کے لئے غیر محدود و غیر مشروط رائے شماری کی اصطلاح استعمال کرتا رہا اور اس اصطلاح کو جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے آئین میں بھی شامل کر کے اسے تنظیم سے منظور کرایا۔ اس اصطلاح کی وسیع تشریح سے جہاں اقوام متحدہ کی کشمیر سے متعلق قراردادوں کی اصل نوعیت عوام تک پہنچی وہاں پوری ریاست کی مکمل خود مختاری کے نظریے کی بھی بالواسطہ طور پر تشریح ہوئی۔

مسلح جدوجہد کا نظریہ

کشمیر میں 1949ء کی جنگ بندی کے بعد تحریک آزادی کشمیر سیاسی جلسوں، اجلاسوں، اخباری بیانات، پریس کانفرنسوں اور قراردادوں تک محدود ہو گئی تھی اور مسلح جدوجہد کا نظریہ ہی پس منظر میں چلا گیا تھا۔ ہم نے اس نظریے کو تحریک آزادی کشمیر میں شامل کرنے کے لئے این ایل ایف قائم کیا اور اس کے بانیوں نے 13 اگست 1965ء کو پشاور میں ہونے والے اپنے پہلے ہی اجلاس میں مسلح جدوجہد کے نظریے کو این ایل ایف کی جدوجہد کی بنیاد قرار دیا۔ این ایل ایف کا یہ منشور جس میں مسلح جدوجہد کو جدوجہد آزادی کا بنیادی ستون قرار دیا گیا تھا میں نے ہی ڈرافٹ کیا تھا۔ محاذ رائے شماری نے اس نظریے کو تیرہ ماہ بعد یعنی اپنے قیام سے تقریباً ڈیڑھ سال بعد 1966ء میں زبردست بحث و تکرار کے بعد اور وہ بھی صرف چند ووٹوں کی اکثریت سے منظور کیا تھا۔ بہر حال این ایل ایف کی طرف سے بھارتی جہاز گنگا کے اغوا کے بعد تو این ایل ایف کا ترانہ

”ایک حل ایک امنگ، گوریلا جنگ گوریلا جنگ“

آزادی کا ایک ہی ڈھنگ گوریلا جنگ گوریلا جنگ“

آزاد کشمیر کے نوجوانوں کا مقبول ترین ترانہ بن گیا تھا (یہ ترانہ غالباً نذیر انجم کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے)

جنگ آزادی کے تین محاذ

دنیا کی معروف تحریک آزادی جنگ آزادی کے تین محاذوں پر مصروف جدوجہد رہتی ہیں۔ یہ تین محاذ سیاسی جدوجہد، سفارتی جدوجہد اور مسلح جدوجہد کے محاذ ہیں۔ کشمیر کی تحریک آزادی 1947ء سے 1949ء تک صرف مسلح جدوجہد اور اس کے بعد صرف سیاسی جدوجہد تک محدود ہو گئی تھی۔ 1976ء میں برطانیہ جانے کے بعد میں نے دنیا بھر کی معروف تحریک آزادی کے طریقہ کار کا مطالعہ کرنے کے بعد تین محاذوں کے اس نظریے کو لبریشن فرنٹ کے لئے اپنایا اور

اسے اندرون ریاست بھی متعارف کرایا گو اس نظریے پر اب تک آزاد کشمیر کی کسی اور تنظیم نے عمل نہیں کیا ہے لیکن ہر تنظیم اس کی اہمیت کو محسوس کرتی ہے۔

میرے کشمیر ذرا جاگ

میرپور آزاد کشمیر کے انقلابی شاعر پروفیسر نذیر انجم کی ایک انقلابی نظم کا ایک شعر ہے۔ ”ارض کشمیر ذرا جاگ کہ کچھ جاہ پسند۔ غیر کو تیرے مقدر کا خدا کہتے ہیں۔“ میں نے شعر کے پہلے لفظ ”ارض“ کشمیر کو ”میرے“ کشمیر میں تبدیل کر کے اسے اپنی تحریروں میں اتنا استعمال کیا کہ یہ شعر لبریشن فرنٹ کے نظریات کا ترجمان گردانا جانے لگا بلکہ کچھ لوگ شعر کو مجھ سے ہی منسوب کرنے لگے۔ بہر حال اس شعر نے بھی نظریہ خود مختار کشمیر کو شرف قبولیت بخشے میں اہم کردار ادا کیا۔

جبری ناطے توڑ دو کشمیر ہمارا چھوڑ دو

ہر تحریک اور جدوجہد آزادی میں مصروف ہر تنظیم کا ایک نعرہ ہوتا ہے جس میں اس تحریک اور تنظیم کے نظریات اور مطالبات کے سمندر کو کوزے میں بند کیا گیا ہوتا ہے۔ کشمیر میں 1946ء کی ”کشمیر چھوڑ دو“ تحریک کے دوران ”معاہدہ امرتسر کو توڑ دو۔ کشمیر کو چھوڑ دو“ کا نعرہ اور حصول پاکستان کی جدوجہد کے دوران ”پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ“ کا نعرہ ان تحریکوں کی جان بن گئے۔ میں چاہتا تھا کہ ہماری تحریک اور تنظیم کا بھی کوئی ایسا نعرہ ہو جو ہمارے نظریات، اغراض و مقاصد اور مطالبات کی ترجمانی مختصر ترین الفاظ میں کرتا ہو۔ چنانچہ میں نے کافی سوچ و بچار کے بعد ”جبری ناطے توڑ دو کشمیر کو چھوڑ دو“ کا نعرہ ایجاد کیا اور اسے کتبوں پر لکھنے کے لئے لبریشن فرنٹ لیوٹن (برطانیہ) شاخ کے ایک نوجوان خوشنویس ملک افتخار کے پاس بھیج دیا۔ افتخار نے ”کشمیر کو چھوڑ دو“ کے الفاظ کی بجائے (بقول اس کے غلطی سے) ”کشمیر ہمارا چھوڑ دو“ لکھ دیا۔ کتبہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ نعرے کی اصل خوبصورتی تو اسی لفظ ”ہمارا“ میں ہے۔ چنانچہ ہم نے (1982ء سے ہی) ”جبری ناطے توڑ دو“ کشمیر ہمارا چھوڑ دو“ کے نعرے کو لبریشن فرنٹ کے نعرے کی حیثیت دی اور اسے خوب استعمال کیا۔ جس کے نتیجے میں یہ نعرہ اندرون ریاست خاص کر نوجوانوں میں بہت مقبول ہو گیا ہے۔

ہمارا پیدائشی ناقابل تنسیخ حق خود ارادیت

محکم قوموں کی آزادی اور خود مختاری کے حق کے لئے بین الاقوامی سطح پر خاص کر اقوام متحدہ کی خط و کتابت اور قراردادوں میں ان قوموں کے ”پیدائشی اور ناقابل تنسیخ حق خود ارادیت“ ”Inherent and inalienable right of self-determination“ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ چونکہ ہمارا یعنی کشمیریوں کا حق خود ارادیت پیدائشی اور ناقابل تنسیخ ہی نہیں بلکہ اسے اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کیا ہے اور بھارت اور پاکستان نے اسے تسلیم کرنے کے علاوہ ہمیں ہمارا یہ حق دینے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ اس لئے میں لبریشن فرنٹ کی طرف سے بین الاقوامی تنظیموں اور بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کو بھیجے جانے والے مراسلوں کے علاوہ اپنے مضامین اور اخباری بیانات میں بھی ”ہمارا پیدائشی ناقابل تنسیخ“ موعود اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حق خود ارادیت یعنی ”Our inherent, inalienable, pledged and internationally recognised right of self-determination“ کی اصطلاح استعمال کرتا ہوں تاکہ دنیا کو پتہ چلے کہ مسئلہ کشمیر بھارت اور پاکستان کے مابین کوئی علاقائی تنازعہ نہیں بلکہ ہماری قومی آزادی و خود مختاری کا مسئلہ ہے۔

ریاست کی تاریخ اور جغرافیہ کے بارے میں اعداد و شمار

میں نے ریاست کی تاریخ اور جغرافیہ کے بارے میں اعداد و شمار اقوام متحدہ کی طرف سے جاری کئے گئے اعداد و شمار اور کشمیر کی تاریخ کا تجزیہ کر کے یہ حقائق اخذ کئے کہ ریاست جموں کشمیر کی آبادی دنیا کے 102 آزاد ممالک کی انفرادی آبادی 31 ممالک کی مجموعی آبادی اور پچیس سے زیادہ آزاد مسلم ممالک کی انفرادی آبادی سے زیادہ ہے۔ ریاست جموں کشمیر کا رقبہ دنیا کے 72 ممالک کے انفرادی رقبے سے زیادہ ہے اور کشمیر اپنی طویل تاریخ کے تین چوتھائی سے زیادہ عرصے کے دوران ایک آزاد و خود مختار ملک رہا ہے۔ میں نے اپنے کتابچوں ”مضامین اور مضامین کے ذریعہ ان حقائق کی وسیع تشریح کی جس سے ریاست کی مکمل خود مختاری کے نظریے کو بڑی تقویت ملی۔



چوتھا باب

میرا مطالعہ

اچھی کتابوں، معلوماتی مضامین اور اخبار و رسائل کا مطالعہ انسان کو ماضی اور حال سے باخبر رکھنے کے علاوہ انسان کی نظر میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتا ہے چنانچہ مطالعہ انسان کے ذہنی نشوونما کے لئے طاقتور اضافی خوراک کی حیثیت رکھتا ہے لیکن بھاری ذمہ داریوں کے حامل انسانوں کے لئے انکی ذمہ داریوں سے متعلق لٹریچر کا مطالعہ ایک اختیاری معاملے کی بجائے ایک امر لازمی کا درجہ رکھتا ہے۔

مسئلہ کشمیر سے متعلق ایک ٹھوس نظریے (نظریہ خود مختار کشمیر) اور اس نظریے کی تکمیل کے لئے ایک ٹھوس طریقہ کار کے داعی اور دونوں کی علمبردار تنظیم کے سربراہ کی حیثیت سے میرے لئے لازم اور ضروری تھا کہ میں مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر سے بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر تعلق رکھنے والے جملہ معاملات خاص کر کشمیر اور مسئلہ کشمیر کی تاریخ، تحریک آزادی کشمیر کے نشیب و فراز، ریاستی عوام کے طرز فکر و عمل، مسئلہ کشمیر اور متعلقہ معاملات کے بارے میں بھارت اور پاکستان کی اصل اور ظاہری پالیسیوں اور رجحانات، مسئلہ کشمیر سے متعلق عالمی رائے عامہ اور دنیا بھر کی حکومتوں کی پالیسیوں، دنیا کی دوسری تحریک آزادی کو درپیش مشکلات اور ان سے نمٹنے کے لئے ان کے طریقوں، دوسری تحریک آزادی اور تاریخ عالم کی اہم شخصیتوں کی سوانح حیات اور سیاسیات عالم کے نئے رجحانات کے علاوہ انسانی نفسیات سے متعلق اچھی کتابوں اور لٹریچر کا بغور مطالعہ کروں لیکن میں ایسا نہیں کر سکا ہوں اور مجھے اپنی اس کمزوری کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ان موضوعات کے بارے میں میرا مطالعہ میری ضرورت کو پورا نہیں کرتا۔ گو میں کشمیری، پاکستانی بھارتی اور بین الاقوامی سطح کے اخبارات اور رسائل کا خاصا مطالعہ کرتا رہا ہوں لیکن متذکرہ بالا موضوعات سے متعلق اچھی کتابوں کے مطالعے کے سلسلے میں میرا سکور ایک سینچری سے زیادہ نہیں جو کہ میری ضرورت سے کہیں کم ہے۔ کتابوں کے مطالعے کے سلسلے میں میری اس محرومی کی بنیادی وجہ تحریک اور تنظیم سے متعلق دوسرے امور کے سلسلے میں مصروفیت ہے۔ ان کتابوں میں سے بھی زیادہ تر میں

نے جیلوں میں اور سفر کے دوران 'بسوں' ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں میں پڑھی ہیں۔ مجھے اپنی اس کمزوری کا شدت سے احساس ہے اور تحریک آزادی سے منسلک اپنے ہم وطنوں خاص کر اہم ذمہ داریوں کے حامل احباب سے میری گزارش ہے کہ وہ اپنی اس اہم ضرورت کے بارے میں پوری ذمہ داری کا ثبوت دیں۔



میری شاعری

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اچھی موسیقی کی طرح اچھے، بامقصد اور زندگی کے حقائق اور پند و نصائح پر مبنی اشعار انسان کے لئے بہترین ذہنی اور روحانی غذا کا کام دیتے ہیں۔ چنانچہ اردو میں اقبال اور فیض اور فارسی میں حافظ، سعدی، رومی اور عربی کے اشعار اور کبھی کبھی دوسروں کے بھی میرے لئے ذہنی اور روحانی غذا کا کام ہی نہیں دیتے بلکہ شدید ذہنی پریشانیوں کے دوران میرے لئے سہارا بھی ثابت ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ جب بھی مسائل میں گھر جاتا ہوں اکیلے میں ان تفکرات سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھنے والے اشعار گنگنا رہتا ہوں جس سے میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہونے کے علاوہ کبھی کبھی ان اشعار کی روح کی روشنی میں ذہن پر مسلط مسائل کا حل بھی نکل آتا ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی کتاب یا مضمون میں کوئی اچھا شعر نظر آئے اسے دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور ذہنی طور پر لطف اندوز ہوتا ہوں۔ کبھی کبھی اپنے مضامین میں بھی مضمون کے مقصد سے تعلق رکھنے والے اشعار شامل کرتا ہوں۔

مئی 1986ء میں میں برکسٹن جیل لندن میں قید تنہائی کاٹ رہا تھا۔ مجھے اس اسیری کے آخری نو ماہ کے دوران باہر سے اخبارات منگانے کی سہولت میسر رہی چنانچہ میں روزنامہ 'جنگ' لندن، روزنامہ 'گارڈین' اور بین الاقوامی سطح کے کچھ رسالے منگاتا تھا۔ ایک دن روزنامہ 'جنگ' لندن میں شائع شدہ کچھ اشعار پر نظر پڑی۔ ان میں سے نوابزادہ نصر اللہ خان کی ایک نظم کا پہلا مصرعہ "میرا قصور قوم کی عظمت کی بات کی" مجھے بہت پسند آیا۔ نوابزادہ صاحب نے اس نظم میں اپنے وہ 'قصور' بیان کئے تھے جنکی پاداش میں انہیں مصائب کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے۔ اس نظم کی روشنی میں میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی تو اپنا آپ بھی 'قصور وار' نظر آیا۔ چنانچہ میں نے قلم اٹھایا اور اپنے 'قصوروں' اور 'جرائم' پر مشتمل اور نوابزادہ صاحب کی نظم کی ہم قافیہ ایک نظم لکھ ڈالی اور چند دن بعد ہفت روزہ انصاف راولپنڈی کے ایڈیٹر میر عبد العزیز کو بھیج دی۔ میر صاحب خود بھی شاعر ہیں چنانچہ انہوں نے انصاف میں اس پر خوب تبصرہ کیا۔ اس کے بعد احباب نے یہ نظم جیل ہی میں لکھے گئے میرے کتابچے "خود مختار کشمیر کیوں" کے آخر میں شائع کر دی۔

میر صاحب کے تبصرے کی روشنی میں میں نے بعد میں اشعار کے الفاظ میں تھوڑا سا رد و بدل کیا۔ بہر حال یہ نظم میری زندگی کی پہلی اور اغلباً آخری شاعری تھی۔
نظم کا عنوان ”اقبال جرم“ اور متن مندرجہ ذیل ہے۔

”اقبال جرم“

برکسٹن جیل لندن مورخہ 18 مئی 1986ء

اپنا قصور قوم کی عظمت کی بات کی آزادی وطن کی ، امم کی ، نجات کی
اپنا جرم ہے کہ غیر کے آگے نہ جھک سکے اپنی خطا ہے فکر وطن کی حیات کی
اپنا قصور طوقِ غلامی نہیں قبول ملتی رہی ہے ہم کو سزا اس ہی بات کی
اک جرم یہ بھی ہے میرا کشمیر ایک ہو باقی نہ کوئی راہ ہے اس کے ثبات کی
بدشاہی دور کی تمنا بھی تو جرم ہے پر جستجو تو ہم نے اس کی دن و رات کی
اقوام متحدہ کی صفوں میں جگہ ملے یہ تو ہمارا حق ہے جہی ڈٹ کے بات کی
پرچم ہمارا پھر سے بلند دنیا بھر میں ہو گو جہد اس کی جرم ہے پردن و رات کی
کرسی پرست درس اہنسا کا دیتے ہیں بٹ نے تو دار پر بھی عقابوں کی بات کی
یہ قید کیا ہے پھانسی بھی منظور ہے آمان
ضامن بنے گر اہل وطن کی نجات کی

پانچواں باب

میرے حریت پسند ساتھی

مکھوم قوموں کی آزادی کا دارومدار بنیادی طور پر اس بات پر ہوتا ہے کہ قوم کے کتنے افراد حصول آزادی کے لئے بڑی سے بڑی یہاں تک کہ اپنی جان کی بھی قربانی کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ کیشریوں کی مسلسل غلامی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قوم کی بھاری اکثریت کا ایک بڑا حصہ تو جذبہ آزادی سے ہی محروم اپنے ذاتی اور عارضی مفادات کے حصول میں سرگرداں ہے اور دوسرا حصہ جذبہ آزادی رکھنے کے باوجود اس کے حصول کے لئے اعلیٰ درجے کی قربانیاں دینے کا جذبہ نہیں رکھتا۔ (گو اس صورت حال کی ذمہ داری عوام سے کہیں زیادہ ان مفاد پرست لیڈروں پر عائد ہوتی ہے۔ جو انہیں حصول آزادی کی بجائے اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں) اس کے باوجود ریاست کے دونوں حصوں میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو حصول آزادی کے لئے اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے درجنوں ایسے افراد کی رفاقت حاصل رہی ہے جنہوں نے حصول آزادی کے لئے ایک سے زیادہ بار اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگایا اور ان میں سے دو نے تو جام شہادت بھی نوش کیا۔ ان عظیم ساتھیوں کے تذکرے کے بغیر نہ تو میری یہ سوانح عمری مکمل ہو سکتی ہے نہ ہی میرا ضمیر اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ میں کتاب میں ان کے خصوصی تذکرے کے ذریعہ انہیں خراج عقیدت پیش نہ کروں۔ ان تمام کی زندگی ہماری تحریک آزادی کی قیمتی متاع اور تاریخ تحریک آزادی کا ایک سنہری باب ہے۔ حصول آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے زبانی زبانی بلند بانگ دعوے کرنا اور حلف اٹھانا کچھ اور ہے اور عملاً قربانیاں دینا اور اپنی زندگی کو داؤ پر لگانا کچھ اور۔ اگرچہ میرے بہت سے ساتھیوں نے تحریک آزادی کے سلسلے میں طویل جیلیں کاٹیں جن کے دوران شدید ترین ذہنی اور جسمانی اذیتیں بھی برداشت کیں اور کچھ خاص کر میر ہدایت اللہ مرحوم اور غلام الدین عشائی مرحوم نے تحریک آزادی کے سلسلے میں اپنی اعلیٰ ملازمتوں کو بھی داؤ پر لگایا۔ لیکن اس باب میں انہی حریت پسندوں کا ذکر ہے جنہوں نے تحریک آزادی کے لئے اپنی اپنی زندگیوں کو رضا کارانہ طور پر داؤ پر لگایا اور ان میں سے کئی نے ایک سے زیادہ بار لگایا۔

شہید کشمیر مقبول احمد بٹ

مقبول بٹ شہید بھارتی مقبوضہ کشمیر کے قصبہ ترہگام (ضلع کپوارہ) میں پیدا ہوئے۔ بارہمولہ سے بی اے کرنے کے بعد 1958ء یا 1959ء میں پاکستان آئے اور پشاور میں بحیثیت صحافی ایک روزنامہ سے منسلک ہو گئے۔ 1965ء میں محاذ رائے شماری کے نو منتخب پبلسٹی سیکرٹری کی حیثیت سے انہوں نے مجھ سمیت تنظیم کے دوسرے عہدیداروں کے ساتھ بھارتی مقبوضہ کشمیر کی مٹی ہاتھ میں لیکر اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوئے حلف اٹھایا کہ وہ مادر وطن کی آزادی پر اپنی جان کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اب تک وہ واحد شخص ہیں جس نے اس حلف کو عملی جامہ پہنایا۔ 1965ء میں ہی میں نے اور شہید نے میر عبدالقیوم اور میجر امان اللہ کی مدد سے جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ (این ایل ایف) قائم کیا اور اس کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے بٹ صاحب اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جون 1966ء میں مقبوضہ کشمیر گئے جہاں وہ گرفتار ہو گئے۔ ان پر سری نگر کی ایک عدالت میں ”کشمیریوں کو بھارت کے خلاف بغاوت کرنے پر اکسانے“ بھارت کے خلاف بغاوت کرنے اور ایک انٹیلی جنس افسر کو قتل کرنے کے الزام میں مقدمہ چلا اور اگست 1968ء میں انہیں اور ان کے ساتھی میر احمد کو سزائے موت سنائی گئی۔ دسمبر 68ء میں وہ سری نگر جیل سے فرار ہو کر آزاد کشمیر پہنچے جہاں انہیں تین ماہ تک زیر حراست رکھنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔ نومبر 1969ء میں وہ جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے صدر منتخب ہو گئے۔ 1971ء میں این ایل ایف نے بھارتی جہاز گنگا اغواء کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ابتدائی طور پر اس کارنامے کا خیر مقدم ہونے اور مسئلہ کشمیر کے بین الاقوامی سطح پر پھر سے اجاگر ہونے کے بعد پاکستان کی بچی خانی حکومت نے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کی ساری لیڈر شپ سمیت سینکڑوں ممبروں کو گرفتار کیا جن میں سے مقبول بٹ سمیت درجنوں افراد کو شاہی قلعہ لاہور اور دلائی کیپ مظفر آباد کے علاوہ دوسرے عقوبت خانوں میں انسانیت سوز ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی گئیں۔ آخر مقبول بٹ سمیت چھ افراد پر مقدمہ چلا اور ان میں سے بٹ صاحب سمیت پانچ افراد کو بری کر دیا گیا۔ مقدمے سے بری ہونے کے بعد بٹ صاحب نے دوسرے احباب سے مل کر این ایل ایف کو دوبارہ منظم کیا اور 1976ء میں حمید بٹ اور ریاض ڈار کو لیکر پھر مقبوضہ کشمیر گئے جہاں بد قسمتی سے پھر گرفتار ہو گئے۔ جس کے بعد انہیں تھار جیل دہلی منتقل کیا گیا۔ جہاں وہ 11 فروری 1984ء کو تختہ دار کو چوم کر امر ہو گئے۔ شہادت سے پہلے بٹ صاحب نے تیرہ سال جیل میں گزارے تھے۔ دس سال بھارتی جیل میں اور تقریباً تین سال پاکستانی جیلوں میں۔

جیسا کہ بٹ صاحب کی شخصیت پر لکھے گئے اپنے کتابچے میں میں نے تفصیل سے لکھا ہے، وہ ایک انتہائی اعلیٰ پائے کے حریت پسند تھے۔ ان سے میری تقریباً پچیس سالہ ذاتی، ذہنی اور نظریاتی رفاقت میری زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ ہے اور خود انہوں نے 1981ء میں برصغیر کے محمد عارف کے نام تہاڑ جیل سے لکھے گئے اپنے خطوط میں لکھا تھا کہ امان صاحب کے ساتھ میرے مضبوط قلبی اور ذہنی رشتے کو وقت کی گرد اور دوسرے عوامل کمزور نہیں کر سکتے۔

ہر عظیم انسان کی طرح بٹ صاحب بھی اپنی اور پرائیوں کے تیروں کا نشانہ بنتے رہے۔ محاذ رائے شماری میں ان کے کچھ ساتھیوں نے 1976ء میں ان کے مقبوضہ کشمیر جانے کے بعد ان سے اور ان کی سرگرمیوں سے لا تعلقی کا اعلان کر کے بھارت کو ان کے خلاف ایک موثر ہتھیار فراہم کیا جسے بھارت نے مقبوضہ کشمیر کے عوام میں بٹ صاحب کے ایج کو مسخ کرنے کے لئے کامیابی سے استعمال کیا اور جب بٹ صاحب نے شہید ہو کر عالمی شہرت حاصل کی تو یہی لوگ ان کی شہرت کو اپنا سیاسی قد اونچا کرنے کے لئے استعمال کرنے لگے۔

بہر حال مقبول بٹ جدید کشمیر کے عظیم ترین سپوتوں میں سے ایک تھے۔

اورنگ زیب شہید

اورنگ زیب شہید گلگت کے علاقہ استور میں پیدا ہوئے ان کی والدہ استور کی تھیں۔ جب کہ والد محمد ایوب خان آفریدی پشاور کے مضافاتی گاؤں پندو سے آکر استور میں آباد ہوئے تھے۔ اورنگ زیب کی ایک خالہ سری نگر میں تھیں۔ اورنگ زیب بچپن سے ہی انتہائی نڈر تھا۔ 1965ء میں وہ اسلامیہ کالج پشاور کا طالب علم تھا۔ جہاں ان کی ملاقات مجبر امان اللہ اور مقبول بٹ سے ہوئی۔ این ایل ایف قائم ہو چکا تھا اور بٹ صاحب وغیرہ مقبوضہ کشمیر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ تحریک آزادی کشمیر کا ذکر چھڑا تو اورنگ زیب نے حسب عادت کہا جب تک کشمیر کے لئے خون نہیں بہایا جاتا۔ اس وقت تک آزادی ناممکن ہے۔ بہر حال کچھ مدت بعد اورنگ زیب این ایل ایف میں شامل ہو گئے اور جون 1966ء میں بٹ صاحب کے ساتھ سری نگر جانے کے لئے مظفر آباد روانہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے آزاد کشمیر ریگولر فورسز کے کمیشن کا امتحان دیا تھا۔ وہ مظفر آباد میں ہی تھے کہ کمیشن کے امتحان میں پاس ہونے کی اطلاع ان کے گھر آ گئی۔ والد نے انہیں اس بارے میں مطلع کیا تو اورنگ زیب والد کو یہ جواب بھیج کر کہ مجھے اے کے آر ایف سے کہیں بڑا کمیشن ملا ہے اور میں اس سلسلے میں اپنے محاذ جنگ پر جا رہا ہوں، مقبوضہ کشمیر روانہ ہو گئے۔

مقبوضہ کشمیر میں وہ تین ماہ تک مقبول بٹ کے ساتھ پوری وادی میں گھومتے اور این

ایل ایف کو منظم کرتے رہے۔ آخر ستمبر میں حسب پروگرام آزاد کشمیر کی طرف واپس آ رہے تھے کہ سو پور کے نزدیک انہیں معلوم ہوا کہ بھارتی انٹیلی جنس سے تعلق رکھنے والے ایک کشمیری پنڈت امرچند کو ان لوگوں کی وادی میں موجودگی کا علم ہوا ہے اور وہ ان کی تلاش میں ہے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ وہ کوئی شرارت کرتا بٹ صاحب وغیرہ نے اسے اس کے گھر سے گرفتار کیا اور اپنے ساتھ لے کر سینٹر فائر لائن کی طرف چل دیئے۔ اطلاعات کے مطابق راستے میں امرچند نے پیشاب کرنے کے بہانے بھاگنے کی کوشش کی تو اورنگ زیب سے اس کی جھڑپ ہو گئی۔ جس سے اورنگ زیب کا چاقو اس کے سینے میں اتر گیا اور امرچند وہاں ہی مر گیا۔ کہتے ہیں امرچند 1947ء میں قبائل حملے کے وقت مسلمان ہو گیا تھا اور قبائل کی واپسی پر اس نے بھارتی فوج کو ان تمام مسلمانوں کے نام بتائے۔ جنہوں نے قبائل کی مدد کی تھی یا ڈوگرہ راج سے آزادی کے لئے کام کیا تھا۔ چنانچہ یہ سارے مسلمان گرفتار کر لئے گئے تھے۔ اورنگ زیب کو اس بارے میں بھی علم تھا۔ چنانچہ امرچند سے اسے ویسے بھی شدید نفرت تھی۔ بد قسمتی سے دوسری صبح کو ہی امرچند کی لاش پر کسی کی نظر پڑ گئی اور اس کی اطلاع بھارتی قابض فوج کو ہوئی تو اس نے فوراً ہی ایک سو مربع میل علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور اپنا دائرہ تنگ کرتی رہی۔ ادھر غلام محمد ڈار نامی ایک شخص جو اصل میں بھارت اور پاکستان دونوں کے لئے جاسوسی کا کام کرتا تھا، کسی طرح بٹ صاحب کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے بھارتی فوج کو وہ جگہ بتائی جہاں بٹ صاحب اور ساتھی روپوش تھے۔ بھارتی فوج نے اس مکان کو گھیرے میں لے لیا۔ بھارتی بٹ صاحب اور ساتھیوں کو گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن اورنگ زیب سے نہ رہا گیا اور اس نے مکان کے اندر سے ہی بھارتی فوج پر گولیاں برسا کر کئی فوجیوں کو ڈھیر کر دیا۔ جب اس کا اسلحہ ختم ہو گیا تو چھرا لے کر باہر نکلا اور اس سے بھی چند ایک پر وار کیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر بھارتی فوج کے ایک افسر نے اورنگ زیب پر برین گن کا ایک پورا برسٹ فائر کیا جس سے اورنگ زیب کا جسم چھلنی ہو گیا اور یہ عظیم حریت پسند وہاں ہی شہید ہو گیا جس کے بعد بٹ صاحب اور میر احمد نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اپنے آپ کو بھارتی فوج کے حوالے کریں۔

اورنگ زیب جیسے عظیم نوجوان تحریک آزادی کشمیر کا بہترین سرمایہ ہیں۔

صوبیدار کالا خان

آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد سے کچھ فاصلے پر واقع ایک گاؤں ساریاں کا رہنے والا یہ مجاہد 1947ء میں کشمیر کی جنگ آزادی کے شمال مغربی محاذ (ٹیٹوال محاذ) پر اپنی جرأت بہادری

اور جنگی مہارت کے کرتب دکھا چکا تھا۔ اپنے گروپ کے ساتھ کپوارہ تک پہنچا تھا۔ میں ان دنوں ہندواڑہ میں پڑھتا تھا۔ وہاں کالا خان کا نام زبان زد عام تھا۔ بھارتی سوراؤں کے لئے کالا خان کا نام عزرائیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ بھارتی فوج اس علاقے کی طرف جانا بھی اپنی موت سمجھتی تھی جہاں کالا خان کی موجودگی کا امکان ہوتا۔ بد قسمتی سے کالا خان کو کمک اور اسلحہ نہیں ملا۔ اس لئے اسے پیچھے آنا پڑا۔ اس کے باوجود ضلع مظفر آباد کے شمالی علاقے کی آزادی میں کالا خان اور اس کے ساتھیوں کا اہم کردار تھا۔ 1966ء میں کالا خان میجر امان اللہ کی وساطت سے این ایل ایف میں شامل ہوا اور مقبول بٹ صاحب کے ساتھ مقبوضہ کشمیر چلا گیا۔ مقبول بٹ اور میر احمد کی گرفتاری اور اورنگ زیب کی شہادت کے دن وہ ان سے الگ ایک اور مکان میں تھا۔ غلام محمد ڈار نے اس کی بھی خبری کی تو بھارتی فوج نے اس مکان کا بھی محاصرہ کیا۔ چنانچہ کالا خان نے بھارتی فوج پر گولیاں برسائیں کئی بھارتی فوجیوں کو ڈھیر کر دیا اور اسی دوران خود بھی شدید زخمی ہو گیا۔ جس کے بعد بھارتی فوج نے اسے گرفتار کیا۔ 1968ء میں اسے سری نگر کی عدالت نے عمر قید کی سزا دی۔ سری نگر جیل میں تقریبات سات سال کی قید کاٹنے کے بعد انہیں قیدیوں کے تبادلے میں پاکستان لایا گیا۔ جہاں حکومت پاکستان نے انہیں کچھ دن حراست میں رکھنے کے بعد رہا کیا۔ 29 نومبر 1982ء کو یہ عظیم مجاہد ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گیا۔

میر احمد عرف یاسین

مقبوضہ کشمیر کے قصبہ بارہمولہ کے نزدیک ایک گاؤں کا یہ نوجوان 1966ء میں مقبول بٹ کی مقبوضہ کشمیر میں موجودگی کے دوران حریت پسندوں کے گروپ میں شامل ہو گیا اور مقامی ہونے کی حیثیت سے اسے حاصل معلومات کے ذریعہ این ایل ایف کے گروپ کی مدد کرتا رہا۔ آخر ستمبر 1966ء میں مقبول بٹ شہید کے ساتھ ہی گرفتار ہو گیا اور سری نگر کی عدالت نے اسے بھی مقبول بٹ کے ساتھ سزائے موت سنائی لیکن اس سزائے موت پر عمل ہونے سے پہلے ہی وہ مقبول بٹ اور یہ ضلع مظفر آباد کے چوہدری محمد یاسین (جو 1965ء سے سری نگر جیل میں تھا) کے ساتھ دسمبر 1968ء میں سری نگر جیل سے فرار ہو کر آزاد کشمیر پہنچا۔ جہاں اسے بھی گرفتار کیا گیا اور مظفر آباد قلعے میں اس پر انسانیت سوز تشدد کیا گیا۔ رہائی کے بعد کچھ مدت کراچی میں رہا۔ اس کے بعد میر پور چلا گیا اور آج کل پھر کراچی میں ہے اور محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پال رہا ہے۔ میر احمد غریب ہی سہی لیکن تحریک آزادی کے لئے اس کی سابقہ قربانی اور جذبہ انتہائی قابل قدر ہیں۔

اشرف قریشی ہاشم قریشی

نوہٹہ سری نگر کے ان دو نوجوانوں نے جنوری 1971ء میں بھارتی ہوائی جہاز گنگا کو جب وہ سری نگر سے دہلی کی طرف پرواز کر رہا تھا ہائی جیک کر کے لاہور پہنچایا۔ جس کے نتیجے میں سردخانے میں پڑا ہوا مسئلہ کشمیر آنا "فانا" ایک بار پھر دنیا کے سامنے آ گیا۔ جہاز کو اغواء کرنا کوئی معمولی کام نہیں ایسا کرنے والے اپنی جان کو داؤ پر لگاتے ہیں۔ گنگا کے اغواء کے بعد دو ماہ تک تو مسئلہ کشمیر برصغیر اور بین الاقوامی اخبارات کی زینت بنا رہا۔ اس کے بعد حکومت پاکستان نے ہائی جیکروں سمیت این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کے سینکڑوں ممبروں کو گرفتار کیا اور دوسرے افراد کے ساتھ ان دونوں پر شاہی قلعہ لاہور میں انسانیت سوز تشدد کیا گیا۔ اس کے بعد ان کے اور دوسرے افراد کے خلاف ایک خصوصی عدالت میں مقدمہ چلا۔ جس میں اشرف قریشی کو تو بری کر دیا گیا البتہ ہاشم قریشی کو 14 سال کی سزا دی گئی۔ جس کے خلاف اپیل کی گئی۔ اپیل کی سماعت 9 سال بعد 1980ء میں ہوئی تو سپریم کورٹ نے ہاشم قریشی کی رہائی کا حکم دے دیا۔ 1982ء میں آزاد کشمیر پاکستان میں لبریشن فرنٹ کے قیام کے بعد ہاشم قریشی اس میں شامل ہو گیا اور 1986ء سے ہالینڈ میں مقیم ہے۔ اشرف قریشی نے رہائی کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے کے جیالوجی میں ایم ایس سی کیا اور آجکل پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ کشمیری زبان میں لیکچرار ہیں۔ دونوں نے پاکستان میں کشمیری خاندانوں میں شادیاں کیں اور اب بچوں والے ہیں۔

حمید بٹ اور ریاض ڈار

شہید کشمیر مقبول بٹ 1976ء میں جن دو نوجوانوں کو اپنے ساتھ مقبوضہ کشمیر لے گئے تھے ان میں سے ایک کا نام عبدالحمید بٹ اور دوسرے کا نام ریاض احمد ڈار ہے یہ دونوں شہید مقبول بٹ کے ساتھ ہی لنکیٹ ہندوارہ میں گرفتار ہوئے اور گزشتہ تقریباً گیارہ سال سے مقبوضہ کشمیر میں پس دیوار زنداں ہیں۔ عبدالحمید بٹ کے والدین 1947ء میں صوبہ جموں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور اب میرپور آزاد کشمیر میں آباد ہیں۔ این ایل ایف سے منسلک ہونے کے وقت عبدالحمید بٹ آزاد کشمیر میں سرکاری ملازم تھے لیکن حصول آزادی کے لئے وہ ملازمت کو ٹھوکر مار کر قافلہ حریت میں شامل ہو گئے۔ ریاض احمد ڈار کے والدین مقبوضہ کشمیر کے علاقہ ترہگام (مقبول بٹ شہید کا آبائی قصبہ) سے آکر پشاور میں آباد ہوئے ہیں۔ اگرچہ میں ان دونوں حریت پسندوں سے سرسری طور پر ہی واقف ہوں لیکن ان کا جذبہ حب الوطنی اور جذبہ قربانی قابل تحسین اور قابل تقلید ہے۔

محمد صدیق بھٹی

برمنگھم برطانیہ میں مقیم ڈویال میرپور آزاد کشمیر کا محمد صدیق بھٹی ایک عظیم حریت پسند ہے اور آجکل بھارتی سفارت کار راوندرا مہاترے کے اغوا کے سلسلے میں طویل مدت کی قید کاٹ رہا ہے۔ سب سے پہلے جون 1977ء میں لندن میں ہمارے مظاہرے کے دوران انڈیا ہاؤس (بھارتی ہائی کمیشن) پر پتھراؤ کے سلسلے میں گرفتار ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے دو اور ساتھی ناظم اور ریاست بھی گرفتار ہوئے تھے۔ اس کے بعد جب 1981ء میں دہلی سے خبر آئی کہ مقبول بٹ کو پھانسی دی جا رہی ہے تو صدیق بھٹی نے اپنے چند اور ساتھیوں کے ساتھ ان کی رہائی کے لئے اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا۔ مقبول بٹ رہا تو نہ ہو سکے لیکن ان کاروائیوں اور سفارتی سطح پر ہماری کوششوں کے نتیجے میں بٹ صاحب پھانسی سے بچ گئے۔

1984ء میں جب وہ گرفتار ہو گیا تو اس کی وکیل نے مجھے بتایا کہ صدیق اسے بار بار کہتا رہا کہ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں لمبی سزا کاٹنے کے لئے تیار ہوں۔ البتہ مجھے صرف یہ فکر ہے کہ اس معاملے کی وجہ سے ہماری تحریک اور تنظیم کو کوئی نقصان نہ پہنچے، جب عدالت نے اسے بیس سال اور سات سال کی سزا سنائی تو صدیق (v) وی کا نشان بنا کر مسکراتے ہوئے عدالت کے کمرے سے ساتھ والے حوالات کی طرف چلا گیا۔ جیل میں میں نے اس سے طویل ملاقات کی تو اس دوران بھی اسی بات پر زور دیتا رہا کہ کم از کم میری فکر نہ کریں میں یہ قید خاموشی سے کاٹ لوں گا۔ البتہ اس بات کا خیال رکھیں کہ تحریک آزادی آگے ہی بڑھتی رہے۔ مجھے اپنی برطانیہ بدری کے بعد بھی اس کے خط ملتے رہے ہیں جو اس کے انتہائی بلند حوصلے کے آئینہ دار ہیں۔ صدیق بھٹی سراپا حریت پسند ہے۔ اپنے خاندان کا واحد کفیل ہونے کے باوجود اس کی یہ قربانیاں یقیناً اس کی عظمت کی آئینہ دار ہیں۔

ریاض ملک

ہمارے ایک انتہائی عظیم ساتھی ملک محمد شفیع آف کرتی کوٹلی آزاد کشمیر حال لیوٹن برطانیہ کے عظیم فرزند محمد ریاض ملک 1984ء تک ایک کھلنڈرے نوجوان تھے۔ لیسٹر پولی ٹیکنک میں زیر تعلیم تھے۔ سفارت کار کے اغوا کے سلسلے میں فروری 1984ء کے اواخر میں ہونے والی گرفتاریوں کے چند دن بعد ایک دن عدالت میں ہمیں یہ سن کر حیرانگی ہوئی کہ ریاض ملک کو بھی گرفتار کیا گیا ہے اور جب واقعات سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ ریاض پر یہ الزام ہے کہ بھارتی

سفارت کار کے اغوا سے لے کر قتل تک ریاض اس کے پاس رہا ہے۔ یہاں تک کہ اسے دوائی بھی کھلاتا رہا ہے۔ اس کی گرفتاری سے لے کر عدالت کے فیصلے تک میں اسے جیل میں ملتا رہا اور ہمیشہ اسے بلند حوصلہ پایا۔ اسے عدالت نے ایک عمر قید اور بارہ سال کی سزا دی تو مسکراتے ہوئے حوالات کی طرف چل دیا۔ اس کے بعد مجھے اس کے خط ملتے رہے۔ میری برطانیہ بدری کے بعد بھی مجھے اس کے خط ملتے رہے ہیں۔ جن سے اس کے بلند حوصلے کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوران اسیری اس نے ایک امتحان بھی پاس کیا ہے۔ ریاض جیسے نوجوانوں پر قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

راجہ عبدالقیوم

کھوئی رٹہ کوٹلی آزاد کشمیر کا یہ خوش شکل اور جوشیلا نوجوان 1981ء میں لبریشن فرنٹ میں شامل ہوا۔ ان دنوں وہ سٹٹ گارٹ مغربی جرمنی میں تھا۔ میری پہلی ملاقات بھی اس سے سٹٹ گارٹ میں ہی ہوئی۔ اس کے بعد وہ فرانس منتقل ہوا۔ فرانس میں قیام کے دوران اس نے مقبول بٹ شہید کو رہا کرانے کے لئے اپنی جان کو داؤ پر لگایا لیکن وہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ جنوری 1984ء میں برطانیہ آیا اور میں اس کی خواہش کے مطابق اسے برطانیہ میں مستقل رہائش کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسی دوران بھارتی سفارت کار کے اغوا کا واقعہ ہوا اور مجھے خاصی دیر بعد معلوم ہوا کہ راجہ قیوم بھی اس میں ملوث تھا۔ ہم نے اسے برطانیہ سے باہر نکالنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ اس کوشش کے دوران ہی (اپنی چھوٹی سی لاپرواہی کی وجہ سے) گرفتار ہو گیا۔ مہارے کے اغوا کے سلسلے میں جس کے خلاف پہلا پرچہ کٹا وہ راجہ قیوم ہی تھا۔ اس کی گرفتاری کے چند دن بعد (مہارے کے اغوا کے تین ہفتے بعد) دوسرے افراد بھی گرفتار ہو گئے۔ عدالت نے راجہ قیوم کو عمر قید اور اٹھارہ سال کی سزا دی۔ اپیل پر چار سال کی تخفیف ہوئی۔ عدالت سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے بھی میری طرف دیکھتے ہوئے (V) وی کا نشان بنایا اور اونچی آواز میں کہا یہ سزا تو کچھ بھی نہیں۔

راجہ قیوم جذباتی ہے، محب وطن ہے، حریت پسند ہے، ساتھ ہی سیمابی طبیعت کا مالک بھی۔ سیمابی طبیعت کے مالک لوگ عموماً شکی مزاج ہوتے ہیں اور بد قسمتی سے راجہ قیوم بھی اس خاں سے مبرا نہیں جس سے کچھ مفاد پرست استفادہ کر کے اس سے میرے خلاف صریحاً بے بنیاد الزامات لگواتے رہے اس کے باوجود میرے دل میں اس کے لئے اب بھی پیار اور احترام کے سوا کچھ نہیں۔

جہانگیر مرزا اور مجید انصاری

برمنگھم میں مقیم میرپور آزاد کشمیر کے ان دو نوجوانوں کو بھی بھارتی سفارت کار کے اغوا کے سلسلے میں تین سال اور دو سال کی سزا ہوئی تھی اور دونوں اپنی یہ سزا کاٹ کر رہا ہوئے ہیں۔ اگرچہ رہائی کے کچھ عرصے بعد اہل خاندان کی طرف سے دباؤ سمیت کچھ وجوہات کی بنا پر ریکی طور پر لبریشن فرنٹ سے الگ ہو کر تحریک آزادی سے ہی لا تعلق ہو گئے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی قربانیوں اور سابقہ حریت پسندی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔



چھٹا باب

عالمی سطح پر میرے واقف کار

تحریک آزادی کشمیر کے سلسلے میں میری سرگرمیوں کے دوران پاکستان میں اور بیرون پاکستان بہت سے زعماء سے میرے سیاسی اور ذاتی تعلقات قائم ہوئے ان اصحاب میں سے اکثر نے تحریک آزادی کشمیر کے سلسلے میں میری خاصی مدد اور حوصلہ افزائی کی جس کے لئے میں ان کا از حد مشکور ہوں۔ ان میں سے اہم شخصیتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

پاکستان سے باہر کے زعماء

جناب صادق المہدی - وزیراعظم سوڈان

صادق المہدی مشہور سوڈانی حریت پسند مہدی سوڈانی (جنہوں نے کئی بار سوڈان کے انگریز قابضوں کے دانت کھٹے کئے) کے پوتے ہیں اور دو بار سوڈان کے وزیراعظم رہے ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات 1979ء میں لندن میں محکوم مسلم ممالک کی آزادی سے متعلق بین الاقوامی کانفرنس میں ہوئی تھی جس میں میں بھی کشمیری وفد کے سربراہ کی حیثیت سے شریک تھا۔ صادق المہدی صاحب کو اس کانفرنس کی سیاسی کمیٹی کا چیئرمین چنا گیا تھا۔ جبکہ میرے سمیت ہر وفد کے کچھ ممبر کمیٹی کے ممبر تھے۔ سیاسی کمیٹی کے پہلے ہی اجلاس میں صادق المہدی صاحب کی تجویز پر مجھے کمیٹی کا سیکرٹری چنا گیا۔ چنانچہ کمیٹی کی طرف سے کانفرنس میں پیش ہونے والی قراردادیں میں نے اور صادق المہدی نے رات کو ان کے کمرے میں ڈرافٹ کر کے صبح کمیٹی سے منظور کرائیں۔ ان سے اس کانفرنس کے بعد بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور انہوں نے ہر جگہ کشمیریوں کے حق خودارادیت کی حمایت کی۔ صادق المہدی صاحب کا شمار عالم اسلام کے صف اول کے سیاسی مفکرین میں ہوتا ہے۔

سالم عزام - سیکرٹری جنرل اسلامک کونسل

جناب سالم عزام سیکرٹری جنرل اسلامک کونسل لندن ایک عظیم الشان اور بہت اچھے مسلمان ہیں۔ پیدائش مصر کی ہے لیکن اب سعودی عرب کے شہری ہیں۔ البتہ مستقل قیام لندن میں ہے۔ کچھ مدت تک برطانیہ میں سعودی عرب کے سفیر بھی رہے۔ عالم اسلام کے مسائل خاص کر محکوم مسلمان قوموں کی آزادی سے انہیں گہری دلچسپی ہے۔ اپنے قیام برطانیہ کے دوران میرے ان سے بہت قریبی تعلقات رہے۔ اسلامک کونسل کے زیر اہتمام ہونے والی ہر کانفرنس میں وہ مجھے مدعو کرتے اور ہر کانفرنس کی افتتاحی تقریر میں کشمیریوں کے حق خود ارادیت کا ذکر ضرور کرتے اور ہر کانفرنس میں اس کے حق میں قرارداد منظور کراتے تھے۔ انہوں نے ایک سے زیادہ بار ذاتی حیثیت سے لبریشن فرنٹ کی مالی مدد بھی کی اور مقبول بٹ شہید کو تختہ دار سے بچانے کے لئے بھی بڑی کوششیں کیں۔

ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان

خالصتان کی جلاوطن حکومت کے بانی صدر ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان سے میرے کئی سال تک گہرے مراسم رہے۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تحریک خالصتان کے جلسوں اور جلوسوں میں ڈاکٹر صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہمارے جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کرتے رہے۔ وہ ایک انتہائی مخلص اور اصول پرست حریت پسند ہیں۔ سیاسی کے علاوہ ہم دونوں کے مابین گہرے ذاتی تعلقات بھی قیام رہے۔ میری برطانیہ بدری کے بعد بھی میرا ان سے رابطہ رہا۔

نور مسواری

فلپائن مسلمانوں کی انقلابی اور سب سے اہم تنظیم مورو نیشنل لبریشن فرنٹ اور فلپائن مسلمانوں کی باغی حکومت کے سربراہ نور مسواری سے میری پہلی ملاقات 1979ء میں لندن میں ہوئی اور اس کے بعد اسلام آباد میں۔ دونوں بار کئی کئی دن تک ساتھ رہا۔ نور مسواری ایک نڈر انقلابی ہیں اور تحریک آزادی کشمیر سے بھی انہیں خاصی دلچسپی ہے۔ ان کی تنظیم کو اسلامی کانفرنس میں مبصر کا درجہ حاصل ہے۔

احمد بن بیلا

الجزائر کی جنگ آزادی کے ہیرو۔ آزاد الجزائر کے پہلے صدر اور اب بین الاقوامی اسلامی کمیشن برائے انسانی حقوق کے چیئرمین جناب احمد بن بیلا سے میری ملاقاتیں لندن میں ہوئیں۔ ایک انقلابی کی حیثیت سے انہیں تحریک آزادی کشمیر سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ اسلامی کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے انہوں نے شہید کشمیر مقبول احمد بٹ کو تختہ دار سے بچانے کی بھی بڑی کوشش کی۔

پروفیسر کورکوت اوزل

ترکی کے سابق وزیر داخلہ۔ وہاں کی اہم ترین اسلامی سیاسی تنظیم کے نائب سربراہ اور مشہور مفکر پروفیسر کورکوت اوزل (ترکی کے موجودہ وزیراعظم ترکوت اوزل ان کے چھوٹے بھائی ہیں) سے میری پہلی ملاقات 1979ء میں ہوئی اور ہم اس کے بعد بھی ملتے رہے پروفیسر اوزل عالم اسلام کے عظیم مفکرین میں سے ہیں اور انہیں تحریک آزادی کشمیر سے بھی گہری دلچسپی ہے اکثر عالمی اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کرتے ہیں اور اپنی ہر تقریر میں تحریک آزادی کشمیر کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔

پروفیسر اسماعیل فاروقی مرحوم

فلسطینی نژاد امریکی اور عالم اسلام کے عظیم دانشور، مورخ اور مفکر پروفیسر اسماعیل فاروقی مرحوم سے بھی میری پہلی ملاقات 1979ء میں ہوئی جس کے بعد ہمارے مابین ذاتی تعلقات قائم ہوئے۔ دسمبر 1979ء میں لندن میں ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں اس بات پر مذاکرہ بلکہ مناظرہ ہوا کہ یروشلم پر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں میں سے کس کا حق سب سے زیادہ ہے۔ مسلمانوں کی نمائندگی پروفیسر فاروقی کر رہے تھے۔ جبکہ عیسائیوں کے دونوں فرقوں (پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک) اور یہودیوں کے عالمی سطح کے عالم ان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس مذاکرے میں یروشلم کے مسلمانوں کے پاس رہنے کے حق میں پروفیسر فاروقی نے اتنے مدلل اور ٹھوس تاریخی، مذہبی، سیاسی اور عملی جواز پیش کئے کہ تینوں مذہبوں کے پیروکاروں پر مشتمل ہزاروں سامعین نے محسوس کیا کہ یروشلم پر سب سے زیادہ حق مسلمانوں کا ہے۔ مذاکرے کے بعد جب میں نے مسلمانوں کی بہترین نمائندگی کرنے پر پروفیسر صاحب کو مبارکباد دی تو مجھ سے

لیٹ کر انتہائی جذباتی انداز میں کہنے لگے آج کا دن میری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ پروفیسر صاحب کو فلسطین کی آزادی کے ساتھ ساتھ کشمیر کی آزادی سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ انہیں چند سال قبل صیہونیوں نے ان کی اہلیہ سمیت قتل کرا دیا۔

غازی خانقان

غازی خانقان صاحب عرب نژاد امریکی ہیں۔ ایک عظیم انسان، اچھے مسلمان اور اچھے عرب ہیں۔ نیو یارک کا ایک ریڈیو اسٹیشن ہر جمعہ کو ایک گھنٹے کے لیے کرایہ پر لیکر اس سے وائس آف اسلام کے نام سے پروگرام نشر کرتے ہیں۔ جن میں عالم اسلام کی اہم خبریں اسلامی دنیا کے مسائل پر مذاکرے اور اسلامی دنیا کی اہم شخصیتوں خاص کر وزرائے خارجہ اور مسلم ممالک کی تحریک آزادی کے سربراہوں کے انٹرویو شامل ہوتے ہیں۔ انہوں نے 1979ء میں میرا تقریباً ایک گھنٹے کا انٹرویو نشر کیا۔ جس میں میں نے مسئلہ کشمیر کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے علاوہ مسئلہ فلسطین پر اپنے موقف کی بھی وضاحت کی۔ جس کے خلاف انہیں یہودیوں کے بہت سے احتجاجی خط آئے۔ انہیں امریکی یہودیوں کی طرف سے دھمکیاں مسلسل ملتی رہتی ہیں لیکن وہ اس کی پرواہ کئے بغیر اپنا مشن جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کشمیریوں کی آزادی سے انہیں خصوصی دلچسپی ہے۔ 1979ء میں مجھے ان ہی کی کوششوں سے اقوام متحدہ کے پریس روم میں پریس کانفرنس سے خطاب کرنے کا موقع ملا تھا۔ ”وائس آف اسلام“ پروگرام کا سارا خرچ خود برداشت کرتے ہیں۔

دوسری شخصیات

درج بالا شخصیات کے علاوہ میری شام کے سابق وزیر اعظم دوالبی، یوگو سلاویہ کے مفتی اعظم احمد یوسف حمدی، مشہور نو مسلم سکالر محمد اسد۔ رابطہ عالم اسلامی کے سابق اور موجودہ سیکرٹری جنرل محمد علی المحرکان اور ڈاکٹر نصیف، امریکی مسلمانوں کے مشہور لیڈر ہشام جابر، دنیا کے تقریباً بیس ممالک کے وزرائے خارجہ، اقوام متحدہ، لندن اور اسلام آباد میں متعین تقریباً ایک سو ممالک کے سفیروں، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سابق صدر اور تنزانیہ کے وزیر خارجہ سلیم احمد سلیم، اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل اٹلی کے مسٹر پیکو، برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر کلاہان، پی ایل او کے وزیر خارجہ فاروق خدومی، برطانیہ اور ڈنمارک کے بہت سے ممبران پارلیمنٹ سے مسئلہ کشمیر پر تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں ہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبران ٹیری ڈیوس، ڈینس ہاول اور لارڈ جیفورڈ اور پی ایل او کے سربراہ یاسر عرفات کے مذہبی امور کے مشیر

ابوہشام صاحب سے قریبی مراسم رہے ہیں اور بھارت کے مشہور لیڈر آنجہانی جے پرکاش نارائن سے ایک تفصیلی ملاقات اور خط و کتابت رہی ہے۔

پاکستانی زعماء

پاکستان میں میرے بہت سے سیاستدانوں، صحافیوں، ادیبوں اور شعراء سے قریبی یا رسمی تعلقات رہے ہیں۔ سیاست دانوں میں جن لوگوں سے قریبی ذاتی اور سیاسی تعلقات رہے ہیں۔ ان میں سابق وزیر خارجہ آغا شانی، پاکستان پیپلز پارٹی کے ملک معراج خالد، (سابق وزیر اعلیٰ پنجاب) جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد اور ڈاکٹر خورشید احمد، پاکستان مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل اقبال احمد خان، قومی محاذ آزادی کے سربراہ معراج محمد خان، پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے سربراہ عابد حسن منٹو اور کسان مزدور پارٹی کے سربراہ فتحیاب خان شامل ہیں۔ جن دوسرے سیاسی لیڈروں سے رسمی ملاقات یا خط و کتابت رہی ہے۔ ان میں پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم (ان سے دو انتہائی دلچسپ اور طویل ملاقاتوں کے علاوہ خط و کتابت بھی رہی) خان عبدالولی خان، مولانا مفتی محمود مرحوم، مولانا غلام غوث ہزاروی مرحوم، مولانا شاہ احمد نورانی، خان عبدالقیوم خان مرحوم، عبدالحمید بھاشانی مرحوم، شیخ مجیب الرحمن مرحوم، خیر بخش مری اور عطاء اللہ مینگل (یہ سب پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے سربراہ ہیں یا تھے) شامل ہیں۔ مشہور شیعہ عالم علامہ رشید ترابی مرحوم سے بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔

پاکستان کے جن سینئر صحافیوں سے میری ملاقاتیں رہی ان میں جنگ کے میر خلیل الرحمن، نوائے وقت کے مجید نظامی، پاکستان ٹائمز کے خواجہ آصف، اردو ڈائجسٹ کے الطاف حسن قریشی، تکبیر کے محمد صلاح الدین، خیبر میل کے عسکری علی شاہ، قومی ڈائجسٹ کے مجیب الرحمن شامی اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلس کے سربراہ منہاج برنا شامل ہیں۔ مشہور شعراء میں سے فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری، کالم نگاروں میں سے پروفیسر وارث میر اور ابراہیم جلیس اور ادیبوں میں حمید کاشمیری سے علیک سلیک رہی ہے۔



ساتواں باب

زندگی کے کچھ یادگار اور سبق آموز واقعات

انسان کی زندگی میں پیش آنے والے کچھ واقعات اس کے دل و دماغ پر گہرے نقش مرتب کرتے ہیں۔ کچھ انتہائی سبق آموز ہوتے ہیں اور کچھ انتہائی متاثر کن۔ میرے ساتھ بھی ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ چند ایک کی تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

1- میں جب 1950ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد سرٹیفکیٹ لینے کے لئے سکول گیا تو واپسی پر میرے ایک محترم استاد سکول گراؤنڈ کے گیٹ تک میرے ساتھ آئے اور راستے میں مجھ سے کچھ یوں مخاطب ہوئے۔ ”ایمان اللہ! تم ایک ذہین اور محنتی نوجوان ہو۔ اس لئے تمہیں سکول سے رخصت کرتے وقت چند نصیحتیں کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اسے انسان کی خوش قسمتی سمجھو یا بد قسمتی کہ وہ اس دنیا میں صرف ایک بار آتا ہے جبکہ اس کے سامنے یہ زندگی گزارنے کے لئے بہت سے راستے ہیں یعنی دولت حاصل کرنے کا راستہ عزت و شہرت کا راستہ۔ اقتدار کا راستہ۔ عیاشیوں کا راستہ اور ان سب سے الگ تھلگ ایک اور راستہ یعنی خدمت خلق کا راستہ۔ اگر انسان دنیا میں ایک سے زیادہ بار آتا تو ہر بار ایک نیا راستہ اختیار کرتا لیکن زندگی صرف ایک ہوتی ہے۔ اس لئے انسان کو اپنی یہ مختصر سی زندگی کسی ایسے راستے پر صرف کرنی چاہئے جو ان سب میں بہترین ہو۔ میری نظر میں بہترین راستہ خدمت خلق کا ہے اور ہم غلام کشمیریوں کے لئے خدمت خلق کی بہترین صورت حصول آزادی کی جدوجہد ہے۔ مجھے امید ہے تم اپنی صلاحیتوں کو اسی جدوجہد پر صرف کرو گے۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے (مجھے اس نصیحت کی شدت کا بخوبی احساس دلانے کے لئے) میرا کان زور سے کھینچا۔

میرے اُس وقت کے ذاتی حالات ایسے تھے کہ میں اس نصیحت کو اپنے لئے خاصی حد تک ناقابل عمل سمجھتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نصیحت کی اہمیت اور افادیت کا احساس ہوتا گیا۔ چنانچہ آج تقریباً چالیس سال بعد بھی مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ماسٹر صاحب میرے کان کھینچ رہے ہیں۔ چنانچہ میں ان کی اس بے بہا نصیحت پر عمل جاری رکھنے کے عزم کا اعادہ کرتا ہوں اور یہ نصیحت مجھے مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ترغیب دیتی رہی

ہے۔

(2) 5 اپریل 1965ء کو سیالکوٹ میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے پہلے کنونشن کے اختتام پر فیصلہ ہوا کہ نو منتخب عہدیدار سوچیت گڑھ کے پاس پاک کشمیر سرحد پر حلف وفاداری اٹھائیں گے۔ میں تنظیم کا سیکرٹری جنرل منتخب ہوا تھا۔ چنانچہ ہم عہدیداروں نے ریاست کے بھارتی مقبوضہ علاقے سے لائی گئی مٹی کو ہاتھ میں لے کر اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر عہد کیا کہ ہم مادر وطن کی آزادی کے لئے جہد مسلسل کریں گے اور اس سلسلے میں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ حلف وفاداری کا یہ منظر انتہائی جذباتی اور سحر انگیز تھا۔

گزشتہ پچیس سال کے دوران میں سینکڑوں بار ایسے حالات و واقعات سے دو چار ہوا ہوں جن میں سے ہر واقعہ عام حالات میں مجھے یا کسی بھی شخص کو تحریک آزادی سے دور لے جانے کے لئے کافی تھا لیکن ہر بار سوچیت گڑھ میں مادر وطن کی مٹی ہاتھ میں لے کر اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے اٹھایا ہوا حلف۔ ہندواڑہ کے قابل احترام استاد کی گوشمالی۔ میرا ضمیر اور میری حب الوطنی تحریک آزادی سے میرے فرار کے راستے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے۔

(3) انگریزی کا ایک مقولہ ہے۔ Noting succeeds like success یعنی کامیابی سے بڑی کوئی کامیابی نہیں۔ بالفاظ دیگر کامیاب انسان کو ہی دنیا عزت و احترام کی نظر سے دیکھتی ہے۔ مجھے زندگی میں اس مقولے کی صداقت کے درجنوں ثبوت ملے ہیں جن میں سے ایک پیش خدمت ہے۔

جیسا کہ میں نے متعلقہ باب میں ذکر کیا ہے۔ کراچی میں اپنے قیام کے ابتدائی دور میں میں مجموعی طور پر مالی حیثیت سے خاصا پریشان رہا۔ یہاں تک کہ 1954ء میں چھ ماہ تک فٹ پاتھ پر بھی سویا۔ کئی ماہ تک جونا مارکیٹ میں تلی ہوئی کھجی بیچنے والے سری نگر کے عبدالاحد (احدو) سے ایک روپیہ روز جیب خرچ اور کھانے کے لئے لیتا اور دوسرے مہینے کے شروع میں سارے پیسے اسے واپس کر دیتا۔ ماما کشمیری ہوٹل لی مارکیٹ میں ایک وقت کا کھانا چار آنے (پچیس پیسے) میں کھاتا تھا یعنی دو آنے کی روٹی دو آنے کی دال۔ ایک بار میں نے تین وقت کا کھانا اُدھار کھایا اور جب چوتھی بار بھی اُدھار مانگا تو ماما ہوٹل کے مالک محمد رمضان نے یہی نہیں کہ کھانا دینے سے انکار کیا۔ بد زبانی بھی کی چنانچہ میں کھانا کھائے بغیر ہی سو گیا۔ دوسرے دن میں نے قرضے کی ادائیگی کی تو محمد رمضان نے بھی گزشتہ رات کی بد کلامی پر معذرت کی۔

وقت گذرتا گیا اور میں آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ 1962ء میں میں نے اپنا ماہنامہ وائس آف کشمیر جاری کیا۔ ماہنامے کی رسم افتتاح ایک مقامی ہوٹل میں پاکستان میں الجزائر کی

جلاوطن حکومت کے سفیر جناب محمد کلونے کرنی تھی۔ میں نے اس فنکشن کے لئے اپنے بہت سے دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ جن میں ماما کشمیری ہوٹل کے محمد رمضان بھی شامل تھے (جن سے میرے تعلقات بڑھتے ہی گئے تھے بلکہ ہم ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف تھے) میں جب اسے دعوت دینے گیا تو اسے مذاقا" کہا کہ فنکشن میں جیب ذرا گرم رکھ کر آنا۔

ایک سفارتی بحران کی وجہ سے محمد کلونے صاحب فنکشن میں نہ آ سکے۔ چنانچہ ماہنامے کا افتتاح پاکستان کے مشہور سائنسدان ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی نے کیا۔ فنکشن کے بعد جب میں ہوٹل کابل ادا کر کے باہر نکلا تو دروازے پر محمد رمضان میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا بوٹا تم نے مجھے کہا تھا کہ جیب گرم کر کے آ جاؤ (وادئ کشمیر والے گلگت بلتستان والوں کو بوٹا کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں) میں نے بھی مذاقا" پوچھا کیا تو جیب گرم کر کے آیا ہے۔ اس پر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو روپے کے نوٹوں کا ایک بٹل نکالا اور کہنے لگا آج کے اس فنکشن کابل میں ادا کروں گا۔ میں نے کہا آپ کی پیشکش کا شکریہ لیکن میں نے بل کی ادائیگی کر دی ہے۔ اس پر اس نے زبردستی سو سو روپے کے کچھ نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیئے۔

یہ وہی رمضان تھا جس نے صرف سات سال پہلے بارہ آنے نہ دینے پر مجھ سے بدکلامی کی تھی اور یہ میری کامیابی ہی تھی جو محمد رمضان میں اتنی بڑی تبدیلی لائی تھی۔

(4) متواتر پیش آنے والے واقعات و حالات نے اس حقیقت کو میرے ایمان کا ضروری حصہ بنا دیا ہے کہ انسان کسی اہم اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے پر خلوص قربانیاں دے تو ان قربانیوں کا دوسروں کے دلوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ذیل میں اس حقیقت کی تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔

(1) جنوری 1971ء کو گلگت کے عوام نے مقامی جیل پر حملہ کر کے ہمیں (مجھے اور مقامی وکلاء کو) باہر نکالا اور ہمیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر جلوس کی شکل میں شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہر میں پولیٹیکل ایجنٹ نے گلگت سکاؤٹس کو جلوس پر فائرنگ کا حکم دیا لیکن گلگت سکاؤٹس (جو سب مقامی تھے) نے ہوائی فائرنگ پر ہی اکتفا کیا۔ اس پر پولیٹیکل ایجنٹ (اے۔ آر صدیقی) نے ایک سپاہی سے رائفل چھین کر خود جلوس پر گولیاں برسائی شروع کیں تو لوگ منتشر ہونے لگے۔ ایک نوجوان مجھے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ بھی ایک گلی کی طرف بھاگنے لگا تو میں نے اسے بھاگنے سے سختی سے منع کیا۔ اتنے میں ایک گولی میرے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزر کر دیوار پر لگی تو اس نوجوان نے مجھے نیچے گرایا اور خود میرے اوپر بیٹھ گیا تاکہ اگر گولی آئے تو اسے لگے اور میں بچ جاؤں۔ گولیوں کی برسات ختم ہوئی اور میں نے اٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگا امان صاحب شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ آپ ہمارے حقوق کے لئے یہ مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔ میرے لئے آپ کی جان میری اپنی جان سے

کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ میں اس نوجوان کا نام بھی نہ پوچھ سکا اور نہ پتہ چلا کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے مجھے کھیت میں متعدد زخمی تڑپتے نظر آئے اور میں ان کی طرف دوڑ پڑا۔ اس نوجوان کا یہ جذبہ ایثار و قربانی میرے لئے پند و نصائح کا ایک خزانہ تھا۔

(2) اگست 1971ء کے اواخر میں مجھے شاہی قلعہ لاہور سے واپس لا کر جیل کی بجائے گلگت سکاؤٹس کے کوارٹر گارڈ (فوجی حوالات) میں رکھا گیا۔ جہاں مجھے دو ڈھائی ماہ تک کسی سے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی۔ دن بھر اندر کوٹھری میں پڑا رہتا تھا۔ رفع حاجت کے لئے مجھے گلگت سکاؤٹس کے سپاہی کوارٹر گارڈ سے کوئی دو فرلانگ دور دریا کے کنارے ملے جاتے تھے اور وہ بھی چھ مسلح سپاہیوں کی حفاظت میں۔ جن میں سے دو اپنی بندوقوں پر نیزے چڑھائے میرے آگے دو پیچھے اور ایک ایک دائیں بائیں ہوتے تھے۔ نومبر میں مجھے ایک ڈیڑھ گھنٹہ روز باہر دھوپ میں بیٹھنے کی اجازت ملی اور بخاری کے لئے کچھ لکڑی بھی ملنے لگی۔ گلگت کے محلہ کشروٹ (یا ڈومیال) کا ایک آٹھ دس سالہ لڑکا آکر میری لکڑی چیرتا اور مزدوری میں اسے لکڑی کے چھوٹے ٹکڑے ملتے۔ لکڑی چیرتے وقت یہ لڑکا مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے مجھے اس طرح پابند دیکھ کر دکھ ہو رہا ہے۔

ایک دن میں دھوپ میں بیٹھا تھا اور گارڈ کے سپاہی آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ میں نے ایک سپاہی سے کہا پوڈر دودھ کی چائے پی پی کر تنگ آیا ہوں کیا آپ نادرن سکاؤٹس کے میس سے کچھ تازہ دودھ لا کر مجھے دودھ کی چائے پلائیں گے۔ سپاہی چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر اطلاع دی کہ دودھ نہیں ملا۔

دوسرے دن سہ پہر کو میں سپاہیوں کی گارد میں دریا کے کنارے سے واپس آ رہا تھا کہ لکڑی چیرنے والے لڑکے پر نظر پڑی جو ایک لمبا چونچہ پہنے ہوئے ہمارے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ اس کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن سپاہیوں کی موجودگی میں مجھ سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور سیدھا اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکا بھی دوڑ کر اندر آ گیا۔ میں اسے وہاں دیکھ کر حیران سا ہو گیا اور ساتھ ہی اسے ڈانٹ بھی دیا کہ وہ میری کوٹھری میں کیوں آیا ہے۔ اس نے انتہائی معصومیت کے ساتھ چونچے کے اندر سے دودھ کی ایک بڑی بوتل نکالی اور مجھے تھماتے ہوئے کہنے لگا امان صاحب کل آپ نے دودھ کی چائے پینے کی خواہش کی تھی لیکن دودھ نہیں ملا تھا۔ میں نے گھر جا کر اس بات کا ذکر اپنی والدہ سے کیا چنانچہ ہم نے اپنی گائے کا دودھ بچایا جو میں آپ کے لئے لایا ہوں۔ میں سمجھا میرے کسی دوست کا بیٹا ہو گا پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یتیم بچہ ہے اور میرے کسی دوست یا جاننے والے کا رشتہ دار بھی نہیں۔ اس کے بعد میں نے پوچھا کہ تمہیں اور تمہاری والدہ کو یہ خیال کیوں آیا تو معصومیت بھرے جذباتی انداز میں کہنے لگا امان

صاحب آپ یہاں کے لوگوں کے لئے اتنی قربانیاں دے رہے ہیں کیا ہم آپ کے لئے اتنا بھی نہ کریں؟ بچے کا جواب سن کر میرے جسم میں روحانی سکون کی عجیب سی لہر دوڑی۔
ایک دن اسے معلوم ہوا کہ مقامی طور پر بنائی جانے والی خیر کی روٹی جسے مقامی زبان میں چھوٹی کہتے ہیں۔ مجھے بہت پسند ہے تو دوسرے دن گھر سے انتہائی لذیذ چھوٹی بنا کر لایا۔
اس بچے اور اس کی والدہ کا یہ ایثار بھی میرے لئے ایک اہم سبق تھا۔

(3) گلگت سکاؤٹس کے کوارٹر گارڈ میں میری اسیری کے دوران کی ہی بات ہے ایک رات دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو گلگت سکاؤٹس کا ایک سپاہی کھڑا تھا۔ جس نے کہا کہ وہ مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے اور آکر فرش پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا امان صاحب آپ کے ساتھ جو برتاؤ ہو رہا ہے وہ اب ہماری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا ہے اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو یہاں سے نکال کر پاکستان بھیج دیں۔ باہر جیپ کھڑی ہے آپ اس پر بیٹھ کر نکل جائیں۔ ہماری ڈیوٹی تین گھنٹے کی ہے اور ہم اس میں مزید تین گھنٹے کا اضافہ کرا سکتے ہیں۔ اس دوران آپ مقامی انتظامیہ کی پہنچ سے باہر نکل چکے ہوں گے۔ میں سمجھا میرے خلاف کوئی جال بچھایا گیا ہے۔ اس لئے میں نے جوان کو خاصا ڈانٹ دیا۔ اس پر اس کے آنسو نکل آئے کہنے لگا امان صاحب آپ ہمیں بالکل غلط سمجھے ہیں۔ ہم اتنے بے غیرت نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے خاصی دیر سوچنے کے بعد اس سے پوچھا کہ یہ تو ایک بہت بڑا جرم ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ ہم نے اس معاملے کے ہر پہلو پر سوچا ہے اور ہماری اس اسکیم میں ہم اس وقت کے گارد والے ہی نہیں بہت سے اور جوان بھی شامل ہیں۔ ہمیں اس جرم کی سزا دو سال قید اور ملازمت سے علیحدگی کی شکل میں ملے گی اور ہم سب نے یہ سزا بھگتنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جب مجھے یقین آیا کہ جوان واقعی یہ پیشکش خلوص دل سے کر رہا ہے تو میں نے اس سے کہا بھائی صاحب آپ لوگوں کا یہ جذبہ ایثار و قربانی میرے لئے باعث فخر ہے لیکن میرا اس طرح یہاں سے نکلنا نہ یہاں کے عوام کے مفاد میں ہے نہ اس مقصد کے جس کے لئے میں یہاں ہوں نہ ہی خود میرے مفاد میں ہے اس لئے میں آپ لوگوں کی اس پیشکش کو قبول نہیں کر سکتا۔ میری طرف سے تمام جوانوں کا شکریہ ادا کریں۔ جوان خاصی دیر تک بھند رہا۔ آخر ناامید ہو کر چلا گیا۔

متذکرہ بالا واقعات اور زندگی میں پیش آنے والے ایسے ہی بہت سے اور واقعات نے میرے ذہن پر اتنے گہرے نقش چھوڑے ہیں کہ ان سے ملنے والی رہنمائی اور ان سے حاصل ہونے والے سبق میرے طرز فکر و عمل کا حصہ اور زندگی کے سفر میں میرے لئے مشعل راہ بن گئے ہیں۔



آٹھواں باب

واقعات جنہوں نے میری زندگی کے رخ موڑ دیئے

انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس وقت تو کافی تکلیف دہ بلکہ ایک سانحہ دکھائی دیتے ہیں اور ان سے انسان کو بہت دکھ بھی ہوتا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات اس کی زندگی میں ایک بڑی اور مثبت تبدیلی کا باعث بنے ہیں۔ زندگی میں میرے ساتھ بھی بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جن میں سے کچھ تو اس وقت میرے لئے ایک بڑے سانحہ سے کم نہ تھے لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ ان واقعات نے میری زندگی کا رخ ہی مثبت سمت میں موڑ دیا۔ آئیے ایسے کچھ واقعات پر ایک نظر ڈالیں۔

میں 1948ء میں ہائی سکول ہندواڑہ (بھارتی مقبوضہ کشمیر) میں نویں جماعت کا طالب علم تھا اور میرا شمار سکول کے قابل ترین طلباء میں ہوتا تھا۔ میرے ایک ہم جماعت پنڈت سری کٹھ کا کوئی رشتہ دار ایک سرکاری عہدے پر تھا۔ جس نے اس کے لئے دسویں جماعت کا امتحان دینے کی خصوصی اجازت حاصل کر لی کیونکہ سری کٹھ ذہین ہونے کے علاوہ خاصی عمر کا بھی تھا اور ہنگامی حالات کی وجہ سے یہ اجازت اسے آسانی سے ملی۔ سری کٹھ کو یہ اجازت ملنے پر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی یہ اجازت حاصل کر لوں۔ چنانچہ خاصی تک و دو کے بعد مجھے بھی یہ اجازت اس شرط پر مل گئی کہ میں دسویں جماعت والوں کے سالانہ امتحان کے لئے فارم بھیجنے سے پہلے ہونے والے امتحان (ٹیسٹ) میں کامیاب ہو جاؤں۔ میں نے دن رات ایک کر کے محنت کی اور ٹیسٹ میں پاس ہو گیا۔ چنانچہ مجھے اجازت مل گئی اور میں نے یونیورسٹی کے امتحان تک کے دو ماہ کے دوران بھی سخت محنت کی۔ ایک استاد سے آدھا گھنٹہ انگریزی پڑھنے کے لئے آتے جاتے ایک گز برف میں تقریباً چار کلو میٹر پیدل چلنا پڑتا تھا سکول اور گھر پر بھی تقریباً پندرہ گھنٹے روز پڑھتا رہا۔

میٹرک کا یہ امتحان نئی بنی ہوئی کشمیر یونیورسٹی کا پہلا امتحان تھا۔ میرا امتحانی سینٹر ایس پی کالج سری نگر تھا۔ پہلا پرچہ انگریزی کا تھا۔ میں سوالنامہ ملتے ہی مضمون لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد امتحانی مرکز کے سپرنٹنڈنٹ نے آکر مجھے کان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور کہنے لگا

میں دس منٹ سے تمہارا رول نمبر پکار رہا ہوں اور تم سنتے ہی نہیں۔ سوالنامہ اور جوابی پرچہ مجھے دے دو اور ہال سے نکل جاؤ۔ تمہیں امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ تمہاری سکول کی حاضریاں مطلوبہ تعداد سے کم ہیں۔ (دراصل ہندواڑہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر نے میرے امتحانی فارم میں امتحان میں بیٹھنے کے میرے خصوصی اجازت نامے کا ذکر کئے بغیر ہی میری صرف نویں کلاس کی حاضریاں درج کی تھیں۔ جو نویں دسویں کی مطلوبہ مجموعی تعداد سے بہت کم تھیں اور یونیورسٹی والوں نے بھی غالباً آخری مرحلے پر حاضریوں کی اس کمی کا نوٹس لیا اور امتحانی مرکز کو اطلاع دے دی کہ کم حاضری والے ان امیدواروں کو امتحان دینے کی اجازت نہیں) اپنے خوابوں پر پانی پھرتے دیکھ کر مجھے رونا آیا۔ بہر حال سپرنٹنڈنٹ نے مجھے ہال سے باہر نکال دیا اور باہر نکلتے ہی غصے میں میں نے اللہ میاں کو بھی برا بھلا کہا کہ میں نے اتنی محنت کی اور اس کا صلہ اس نے مجھے یہ دیا۔ باہر نکلا تو سری کنٹھ بھی کھڑا رو رہا تھا کچھ اور لڑکے بھی تھے۔ ہم نے یونیورسٹی کے حکام کے علاوہ کچھ لیڈروں سے بھی ملنے کی کوشش کی لیکن امتحان دینے کی اجازت حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے۔

دوسرے سال بھی میں نے خاصی محنت کی اور میٹرک کے امتحان میں پوری یونیورسٹی میں مسلمان طلباء میں اول آیا اور کالج میں داخلہ لے لیا۔

اگر مجھے پہلے سال امتحان دینے سے نہ روکا جاتا تو میں زیادہ سے زیادہ سیکنڈ ڈویژن (بی گریڈ) میں پاس ہوتا اور اپنے مخصوص حالات (جو مجھے کالج میں داخلہ لینے کی اجازت کسی صورت میں نہیں دیتے تھے) کے تحت میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میٹرک کرنے کے بعد پنواری یا سکول ٹیچر کی حیثیت سے سرکاری ملازمت کروں لیکن پہلے سال امتحان دینے کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے میں نے دوسرے سال ایک تو پوری یونیورسٹی میں پوزیشن حاصل کی اور دوسرے اپنے مالی معاملات بھی خاصی حد تک سدھارے چنانچہ میرے لئے آگے بڑھنے کے راستے کھل گئے اور میں آج یہاں ہوں۔ اگر 1949ء میں امتحان دینے کی اجازت مل جاتی تو آج شاید میں ایک گروڈاور یا پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہو گیا ہوتا لیکن امتحانی ہال سے نکالے جانے کے سانحہ نے میری زندگی کا رخ ہی بدل ڈالا۔

(2) میں 1956ء میں کراچی میں سٹی ٹائٹ سکول میں پڑھاتا تھا۔ ایک دن سکول کے وقفے کے دوران میں نے سٹاف روم میں طلباء کے حقوق کے بارے میں سکول کی انتظامیہ کی پالیسی اور طرز عمل پر معمولی سی نکتہ چینی کی تو سکول کے قائم مقام ہیڈ ماسٹر نے (جس سے میرے تعلقات ویسے بھی کچھ کشیدہ تھے) بڑے تحکمانہ انداز میں کہا ”تم کل کے لونڈے تم انتظامی معاملات کو کیا جانو“ اس طرز تکلم پر مجھے انتہائی غصہ آیا چنانچہ میں یہ کہہ کر سٹاف روم سے باہر نکل آیا کہ یہ لونڈا ثابت کرے گا کہ اس میں انتظامی صلاحیت تم سے کہیں زیادہ ہے۔ باہر نکل کر میں

سیدھا گھر کی طرف چل دیا۔

اس واقعے کا ذکر کسی استاد نے کلاس میں کر دیا۔ چنانچہ چھٹی ہونے تک یہ بات سارے سکول میں پھیل گئی۔ میرا معمول تھا کہ میں سکول سے گھر آتے ہوئے راستے میں ایک بلوچ پان والے سے سگریٹ لیتا اور ساتھ ہی ریڈیو پاکستان سے خبریں بھی سنتا تھا۔ اس دن بھی میں خبریں سننے کے لئے وہاں رک گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سکول کے طلباء بھی وہاں سے گزرے اور مجھے دیکھ کر رک گئے اور میرے ساتھ پیش آنے والے واقعے پر اظہار افسوس کیا۔ اسی دوران ان میں سے ایک لڑکے نے کہا سر آپ اتنی محنت کرتے ہیں سنا ہے تنخواہ بھی بہت ہی کم ملتی ہے اور آپ کے ساتھ یہ برتاؤ ہوتا ہے اور وہ بھی طلباء کے مفاد کی بات کرنے پر۔ آپ اپنا سکول کیوں نہیں کھولتے۔ میں نے کہا میرے پاس نہ جگہ ہے نہ طلباء، سکول کیسے کھولوں۔ اس پر بلوچ پان والے نے کہا میرے پاس چار کمروں والا ایک مکان خالی ہے آپ اس میں سکول کھول لیں۔ طلباء نے کہا ہم بھی سٹی ناٹ کی بجائے آپ کے سکول میں پڑھیں گے۔ ان لوگوں کی یہ باتیں سن کر میرے دل میں بھی خیال آیا کہ کیوں نہ ان کی تجویز پر عمل کیا جائے اور رات کو معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے میں نے اپنا سکول قائم کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔ بلوچ پان والے کا مکان تو اس کے بھائی کی مخالفت کی وجہ سے نہیں ملا لیکن میں نے پندرہ دن کے اندر اندر ناٹ اسکول اپنی رہائشی کوٹھری میں کھولا۔ جسے دوسرے سال ایک چار کمروں والی عمارت میں منتقل کر کے وہاں اپنا ڈے سکول بھی کھولا اور ان سکولوں نے میری زندگی کا رخ ہی موڑ دیا۔ اگر میرے ساتھ سٹی ناٹ سکول میں وہ انتہائی تکلیف دہ برتاؤ نہ ہوتا تو مجھے اپنا سکول قائم کرنے کا خیال شاید کبھی نہ آتا۔

(3) مقبوضہ کشمیر سے پاکستان آنے کے بعد ابتداء میں میں اپنے بزرگوں خاص کر برادر محمد اسماعیل خان کے زیر اثر تھا۔ جن کا پروگرام یہ تھا کہ میں ایف ایس سی پاس کرنے کے بعد گلگت کے محکمہ جنگلات میں ریجن آفیسر کی حیثیت سے سرکاری ملازمت کروں یا انجینئر بن جاؤں لیکن ایڈورڈز کالج کے وائس پرنسپل سے جھگڑے کی وجہ سے کالج سے نکالے جانے کے نتیجے میں مجھے کراچی آنا پڑا (کالج سے اخراج کے واقعے کی تفصیل ”میرا بچپن اور میری تعلیم“ کے باب میں ہے) اور کراچی کے مخصوص سیاسی ماحول۔ میری خود کفیلی اور کشمیری حلقوں کے ساتھ تعلقات نے مجھے فاریسٹ ریجن آفیسر یا انجینئر کی بجائے تحریک آزادی کشمیر سے منسلک کر دیا۔ اگر ایڈورڈز کالج پشاور کا سانحہ پیش نہ آتا تو آج میں موجودہ پوزیشن کی بجائے محکمہ جنگلات کا ایک افسر یا انجینئر ہوتا۔

(4) آپ نے اس کتاب کے حصہ اول میں میرے تعلیمی ادارے کے باب میں حبیبہ ایجوکیشنل سوسائٹی والوں سے میرے جھگڑے کی تفصیلات پڑھی ہوں گی اگر سوسائٹی کے سربراہ

اور ان کے ہیڈ ماسٹر مجھے اپنے سکول سے بے دخل کرنے کی کوشش نہ کرتے تو میں اپنے ڈے سکول سے 1972ء میں ہاتھ دھو بیٹھا ہوتا اور نائٹ اسکول بھی انہی چار کمروں تک محدود رہتا لیکن اس سانحے نے مجھے اپنے سکولوں کے لئے دوسری عمارت حاصل کرنے کے سلسلے میں مسلسل تگ و دو کرنے پر مجبور کیا جس کے نتیجے میں میں دو بڑے اور اعلیٰ معیار کے سکول قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ان سکولوں نے میری کایا ہی پلٹ دی۔

5) میری زندگی کا رخ موڑ دینے والا ایک اہم واقعہ کسی سانحے کے بغیر ہی پیش آیا۔ غالباً 1958ء کی بات ہے میں نے مسئلہ کشمیر پر ایک مضمون لکھا اور اسے لے کر روزنامہ ڈان کراچی (جو اس زمانے میں پاکستان کا اہم ترین انگریزی اخبار تھا) کے ایڈیٹر الطاف حسین مرحوم کے پاس پہنچا۔ مسئلہ کشمیر تازہ تھا۔ اقوام متحدہ کے نمائندے مسئلہ کشمیر پر بھارت اور پاکستان کی حکومتوں سے مذاکرات میں مصروف تھے۔ الطاف حسین صاحب بھی اس وقت کچھ فارغ دکھائی دیتے تھے اور انہیں غالباً مسئلہ کشمیر پر کسی کشمیری کے لکھے ہوئے مضمون کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے میری موجودگی میں ہی میرا مضمون پڑھ ڈالا اور جب انہیں میں نے بتایا کہ میں ابھی طالب علم ہوں تو انہوں نے مجھے شاباشی دی اور میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ میں قلمی کاوشیں جاری رکھوں۔ انہوں نے اس امید کا اظہار بھی کیا کہ اگر میں لکھنا جاری رکھوں تو ایک دن انگریزی زبان کے اعلیٰ پائے کا راسٹر بن جاؤں گا۔ پاکستان کے صف اول کے صحافی کی طرف سے اس حوصلہ افزائی سے میں پھولا نہیں سمایا اور جب کچھ مدت کے بعد میرا مضمون ڈان کے ادارے والے صفحے پر شائع ہوا تو وہ دن میری اُس وقت تک کی زندگی کا اہم ترین دن معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے لکھنا شروع کر دیا اور اس کے بعد میرے قلم سے جو کچھ نکلا اس کی تفصیل کتاب کے متعلقہ باب میں ہے۔

اس طرح الطاف حسین مرحوم کی طرف سے میری یہ حوصلہ افزائی جو بنیادی طور پر متذکرہ بالا چند اتفاقات کا نتیجہ تھی میرے قلم کے لئے اکسیر ثابت ہوئی۔

6) برطانیہ میں میری گرفتاری اور پندرہ ماہ کی اسیری کے بعد برطانیہ بدری کے ظاہری سانحے کا دلچسپ روشن پہلو یہ ہے کہ دوران اسیری ہونے والے میرے میڈیکل چیک اپ کے نتیجے میں میرے ہیکسٹروں کے کینسر کی تشخیص ہوئی اور فروری 1986ء میں میرا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اگر یہ آپریشن نہ ہوتا تو میں زیادہ سے زیادہ اگست 1986ء تک زندہ رہ سکتا تھا۔ اس طرح گرفتاری کے ظاہری سانحے نے مجھے نئی زندگی بخشی۔

الغرض انسانی زندگی کے ہر سانحے کا ایک روشن پہلو اور ہر خوشخبری کا ایک تاریک پہلو بھی ہوتا ہے البتہ کچھ لوگوں کو پیش آنے والے اکثر سانحے بالآخر ان کے لئے زندگی میں بڑی کامیابیوں کا باعث بنتے ہیں۔ میں شاید ان ہی خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں۔

نواں باب

.... اور میں موت کے منہ سے واپس آتا رہا

میں اپنی اب تک کی زندگی میں ایک درجن سے زیادہ بار موت کے منہ سے واپس آیا ہوں اور تقریباً ہر بار مجھے کوئی اتفاق ہی موت کے منہ میں جانے سے بچاتا رہا ہے۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ ان واقعات میں سے چند ایک کی تفصیل بیان کی جائے لیکن ان واقعات کی تفصیل میں جانے سے پہلے اس دلچسپ واقعے کا ذکر جب میری فاتحہ بھی پڑھی گئی۔

میں 1947ء کے اواخر میں ہندواڑہ میں تھا اور اس علاقے پر ہندوستانی فوج قابض ہو گئی تھی جبکہ ہائی ہامہ کا علاقہ جہاں میری ہمیشہ رہتی تھیں پاکستانی قبائل اور مقامی حریت پسندوں کے زیر اثر تھا۔ اس سے قبل ہندواڑہ کے قریب کلنگام کے پل پر قبضے کے سلسلے میں ہندوستانی فوج اور قبائل کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی تھی جس میں مقامی آبادی کے کچھ لوگ بھی مارے گئے تھے۔ آخر بھارتی فوج نے ٹینکوں کی مدد سے پل پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس لڑائی کے فوراً بعد ہائی ہامہ میں میری بہن اور بہنوئی کو اطلاع ملی کہ میں اس جنگ کے دوران مارا گیا ہوں بلکہ ایک صاحب نے انہیں بتایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے گولی لگتے دیکھا۔ چنانچہ میری ہمیشہ اور بہنوئی نے سرسری طور پر میری فاتحہ بھی پڑھائی کیونکہ بھارتیوں کی پیش قدمی کی وجہ سے وہ لوگ خود بھی افراتفری میں تھے۔ بھارتیوں نے میرے بہنوئی کے داماد (مبجر) امان اللہ کے گھر اور مہمان خانے پر بمباری کر کے انہیں ملیا میٹ کر دیا تھا۔ چنانچہ میری ہمیشہ سمیت گاؤں کی خواتین نے ایک پہاڑی گاؤں بڑ پورہ کے جنگل میں پناہ لی تھی اور وہاں تک کے سفر کے دوران بھارتی بموں کا ایک گولہ ہمیشہ وغیرہ سے چند گز کے فاصلے پر گرا تھا لیکن ایک گز سے زیادہ برف میں دھنس کر پھنسا نہیں تھا۔ اس طرح میری ہمیشہ وغیرہ کی جانیں بھی معجزاتی طور پر بچ گئی تھیں۔ کچھ مدت بعد ہندواڑہ اور ہائی ہامہ کے پورے علاقے پر بھارتیوں کا قبضہ ہو گیا اور دونوں کے درمیان سول آبادی کی کچھ آمدورفت شروع ہوئی تو میں نے رسک لے کر ہائی ہامہ جانے کا فیصلہ کیا تاکہ ہمیشہ وغیرہ کی خیر خیریت معلوم کروں کیونکہ ہائی ہامہ پر بھارتیوں کی بمباری کے بارے میں انتہائی پریشان کن خبریں آرہی تھیں۔ میں ہندواڑہ (براری پورہ) سے صبح سویرے پیدل روانہ ہوا اور

بڑی سڑک سے الگ ہو کر چلتا رہا اور ہائی ہامہ شام کو پہنچا۔ بہنوئی کے ہاں پہنچا تو کتنا مجھے دیکھ کر بھونکنے لگا چنانچہ میرے بہنوئی کا نوکر باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی واپس اندر بھاگ گیا۔ دراصل وہ مجھے بھوت سمجھا تھا کیونکہ اس کی اطلاع کے مطابق میں مرچکا تھا اور میری فاتحہ بھی پڑھی گئی تھی۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے زور زور سے آوازیں دیں تو میرے بہنوئی باہر آئے اور خاصی دیر تک دور سے مجھے دیکھتے رہے اور جب میرے بار بار اصرار پر کہ میں امان اللہ ہی ہوں۔ انہیں یقین آیا تو کتے کو دور بھگا کر آکر مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ دوسرے دن جب میں ۱۰ پورہ اپنی ہمشیرہ کے پاس پہنچا تو وہاں بھی سب مجھے زندہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ تھا میری فاتحہ پڑھی جانے کا لطیفہ۔ آئیے اب میرے موت کے منہ سے واپس آنے کے واقعات کی طرف۔

بچپن میں مجھے میرے خاندانی دشمنوں نے زہر کھلا کر ہلاک کرنے کی کوشش کی لیکن میں معجزاتی طور پر بچ گیا۔ ایک بار کراچی میں پاکستان ایئر فورس کے ایک بڑے ٹرک کے نیچے آتے آتے بچ گیا۔ جبکہ ٹرک اس سائیکل کے اوپر سے گزرا جس پر میں سوار تھا۔ ایک بار کراچی کے ساحل منوڑا میں سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے بچ گیا۔ ایک بار میں سائیکل رکشے پر سوار تھا کہ رکشہ ایک تیز رفتار ٹرام سے ٹکرایا اور میں ٹرام کے نیچے آنے کی بجائے اچھل کر ٹرام کے اندر جا گرا۔ جنوری 1953ء میں کراچی میں ہونے والے طلباء کے ہنگاموں کے دوران (جس میں آٹھ طالب علم پولیس فائرنگ سے ہلاک ہوئے تھے) ایک گولی میرے سر سے ایک ڈیڑھ انچ کے فاصلے سے گزر کر دیوار پر لگی۔ ایک بار میں بجلی کا مین سوچ آف کر کے اپنے کمرے کی بجلی ٹھیک کرنے کے لئے بجلی کی تار منہ میں ڈال کر دانتوں سے اس کا بڑا تار رہا تھا کہ باہر سے کسی نے بیخبری میں سوچ آن کر دیا۔ بجلی کا جھٹکا لگنے سے میں اچھل کر گر گیا اور میرے بدن کا زور تار پر پڑا جس سے تار میرے منہ سے الگ ہو گئی۔ اس کے بعد سے میں خالی تار سے بھی ڈرتا ہوں۔ نیویارک میں ایک بار میں انڈر گراؤنڈ (زیر زمین ریل) میں ہونے والے ایک ہنگامے میں گر گیا اور سینکڑوں افراد مجھے روندتے ہوئے میرے اوپر سے گزرے لیکن میں معجزاتی طور پر بچ گیا۔ ایک بار میں راولپنڈی سے براستہ برار کوٹ مظفر آباد جا رہا تھا۔ برار کوٹ اور لوہار گلی کے درمیانی چڑھائی میں بس کا ہار کھل گیا اور بس پیچھے لڑھکنے لگی۔ اتفاق سے سڑک کے کنارے اس جگہ جہاں سے بس نیچے دریا میں گرتی ایک بڑا پتھر تھا اور بس اس سے لگ کر رک گئی اگر وہ پتھر وہاں نہ ہوتا تو بس چند لمحوں میں کئی سو گز نیچے دریا میں گرتی اور میرے سمیت ساری سواریاں لقمہ اجل ہو جاتیں۔

یہ تو تھا آٹھ واقعات کا سرسری سا تذکرہ۔ اس موضوع کے کچھ واقعات ایسے ہیں جن کا تفصیلی تذکرہ مناسب سمجھتا ہوں۔

(1) میں چار سال کا تھا ایک دن اپنی بہن جو مجھ سے سات آٹھ سال بڑی تھیں کے ساتھ اپنے مویشی خانے کی چھت پر کھیل رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے چھت پر پھسلن ہوئی تھی چنانچہ میں کھیلتے کھیلتے پھسل کر سر کے بل چھت کے نیچے پڑے ہوئے تراشیدہ پتھروں پر گرا اور سر ایک نوک دار پتھر سے جا لگا۔ پتھر کی نوک میرے ماتھے میں گھس گئی اور ماتھے سے خون کے فوارے نکلنے لگے۔ میری بہن چیختی ہوئی اندر کو دوڑی۔ گھر میں صرف خواتین تھیں جو روتی پٹی باہر آگئیں عین اسی وقت میرے بہنوئی ماسٹر ہاشم علی (مرحوم) جو ایک ماہر طبیب بھی تھے اور ان کے پاس ادویات کا سٹاک بھی ہوتا تھا غیر متوقعہ طور پر گھر پہنچے اور انہوں نے میرے ماتھے میں گھسا ہوا پتھر نکال دیا اور کوئی دوائی لگا کر تھوڑی دیر میں خون بھی بند کر دیا۔ اس طرح میں بچ گیا۔ آج پچاس سال بعد بھی اس زخم کا نشان میرے ماتھے پر صاف نظر آ رہا ہے۔

اگر میرے بہنوئی اتفاق سے اور انتہائی غیر متوقعہ طور پر اس وقت گھر نہ پہنچتے تو زیادہ خون بہہ جانے سے میری موت یقینی تھی۔ لیکن ماسٹر صاحب کی آمد مجھے موت کے منہ سے واپس لے آئی۔

(2) متذکرہ بالا واقعے کے کچھ مدت بعد میں اپنے مکان کے سامنے کھیت میں برج پتر کے پائنتو باندھ کر کچھ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس زمانے میں استور کے مقامی لوگ سفر کی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے اپنی ٹانگوں کے گرد اون کی بنی ہوئی ایک لمبی پٹی باندھتے تھے۔ جسے مقامی زبان میں پائنتو کہتے ہیں۔ ہم بچوں نے برج پتر کے کاغذ کی طرح کے چھلکوں کے پائنتو بنا کر اپنی ٹانگوں پر باندھے تھے۔ برج پتر فوراً آگ پکڑتے ہیں۔ میری ایک ہم عمر بھانجی (ڈاکٹر محبوب عالم کی بہن جو میری رجائی بہن بھی ہے) نے جلتی ہوئی دینی میری ٹانگ کے ساتھ لگا دی جس سے فوراً ہی اس کے گرد لپٹے ہوئے برج پتر میں آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور سارے بچے چیخنے لگے۔ اتفاق سے میری والدہ وہاں سے گزر رہی تھیں اور انہوں نے مجھے آگ کے شعلوں میں لپٹا اور چیخا دیکھ کر مجھے اٹھایا اور دوڑ کر گھر کے باورچی خانے کے ساتھ رکھی پانی سے بھری ہوئی ایک بہت بڑی دیگ میں پھینک دیا۔ اس طرح میں بچ گیا گو میری دائیں ٹانگ کی چھڑی جل کر اس کی ہڈی بھی ننگی ہو گئی تھی اور آج پچاس سال بعد بھی میری ٹانگ کی جلی ہوئی چھڑی اس واقعے کی شدت کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔

اگر میری والدہ کی آمد میں صرف چند ہی منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو میں جل کر راکھ ہو گیا ہوتا۔

(3) 1959ء کا واقعہ ہے میں اپنے گھر استور سے کراچی آنے کے لئے گلگت آیا اور راولپنڈی جانے کے لئے ہوائی سروس موسم کی خرابی کی وجہ سے بند ہونے کی بناء پر مجھے بارہ دن گلگت میں رکنا پڑا۔ اس زمانے میں قراقرم ہائی وے نہیں بنی تھی اور بابو سر روڈ بھی بارشوں کی

وجہ سے خراب ہو گیا تھا۔ میں ہر صبح فلاٹ ہونے کی امید میں ماموں جان اور برادر محمد اسماعیل خان وغیرہ سے رخصت ہو کر ایئر پورٹ پہنچتا اور عین وقت پر ”نو فلاٹ ٹو ڈے“ کا اعلان سن کر واپس چلا جاتا اور واپس پہنچ کر خاصی خفت اٹھانی پڑتی۔ آخر تیرہویں دن ایک مال بردار ڈکونا جہاز اسکرو سے (جہاں وہ اتنے دن سے رکا ہوا تھا) گلگت آیا اور اس کے پائلٹ نے راولپنڈی جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم کچھ لوگوں نے ایئر پورٹ کے حکام اور پائلٹ کی منت ساجت کر کے انہیں اس بات پر راضی کیا کہ ہمیں بھی اس جہاز میں راولپنڈی جانے دیں اور ہم جہاز میں رکھے ہوئے تھوڑے سے سامان پر بیٹھ گئے۔

جہاز چلاس سے آگے ہوا تو موسم اچانک انتہائی بھیانک ہو گیا اور اندھیرا سا چھا گیا اور اس کے ساتھ ہی جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ ہم ہر ہچکولے پر کبھی جہاز کی ایک دیوار سے ٹکرا جاتے کبھی دوسری سے۔ زندگی کی کوئی امید نہیں رہی۔ چنانچہ کچھ زور زور سے کلمہ پڑھ رہے تھے اور کچھ آیت الکرسی۔ ہمارے ساتھی خواجہ ثناء اللہ سجدے میں گرے گز گز رہے تھے۔ اتنے میں جہاز کو ہچکولہ لگا اور وہ سرینچے اور ٹانگیں اوپر ہو کر دیوار سے جا لگے۔

یہ صورت حال کوئی چالیس منٹ تک قائم رہی۔ اس دوران ہر لمحہ ہماری زندگی کا آخری لمحہ معلوم ہوتا تھا۔ بہر حال یہ ایک انتہائی غیر معمولی معجزہ تھا کہ جہاز کا ماہر اور تجربہ کار پائلٹ دنیا کے اس خطرناک ترین ہوائی سفر میں راڈار وغیرہ کی جدید سہولتوں سے محروم اس ڈکونا جہاز کو عملاً رات کے سے اندھیرے میں صرف اندازے سے دریائے سندھ کے اوپر اور پہاڑوں کے درمیان سے گذارتا ہوا میدانی علاقے میں پہنچانے میں کامیاب ہو گیا اور جب ہم راولپنڈی میں جہاز سے اترے تو ہمیں اپنے زندہ بچنے کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ راولپنڈی ایئر پورٹ پر موجود دوسرے پائلٹ بھی حیران تھے کہ یہ معجزہ کیسے ہوا۔ بہر حال ہم ایک گھنٹے کے انتہائی کرب اور زندگی سے مکمل ناامیدی کے بعد موت کے منہ سے نکل کر راولپنڈی پہنچے تھے۔

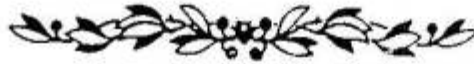
(4) برطانیہ میں میری اسیری کے دوران 28 فروری 1986ء کی صبح کو گرانی روڈ ہسپتال لیٹر میں میرا ہمسفر کے کینسر کا آپریشن ہوا۔ چار بجے تک میں پوری طرح ہوش میں آیا تھا۔ البتہ کبھی کبھی غنودگی سی چھا جاتی تھی۔ اسی دوران میری اہلیہ ملنے آئی۔ اہلیہ کے واپس جانے کے دس پندرہ منٹ بعد یعنی تقریباً چھ بجے مجھے محسوس ہونے لگا کہ میری نبض ڈوب رہی ہے۔ پیشاب پہلے سے بند تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ہچکیاں لگنے لگیں جیسے مرنے سے تھوڑی دیر پہلے لگتی ہیں اور مجھے پورا یقین ہو گیا کہ میری زندگی کا اختتام ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں اپنی موت کے تحریک آزادی کشمیر، اپنی تنظیم اور اپنی اہلیہ اور بچی پر پڑنے والے ممکنہ اثرات کا سوچ کر آبدیدہ ہو گیا۔ اسی دوران میں نے اشارے سے انگریز نوجوان لیڈی ڈاکٹر جو ڈیوٹی پر تھی کو بلایا اور اسے اشاروں سے اپنی نبض وغیرہ کے بارے میں بتایا۔ میری ہچکیاں وہ خود دیکھ اور سن رہی

تھی اور اسکے ساتھ ہی میں بے ہوش ہو گیا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب میں پھر ہوش میں آیا تو میرے سرہانے کے پاس کھڑی لیڈی ڈاکٹر نے مجھے یہ کہہ کر مبارک باد دی کہ مسٹر خان تم بڑے خوش قسمت ہو تمہاری زندگی بچ گئی۔ میری اس خوش قسمتی کی تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ جب تم نے اس صورت حال کے بارے میں مجھے بتایا تو میں بہت پریشان ہو گئی۔ کیونکہ ان معاملات کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ ڈاکٹر بلی (بڑے سرجن جنہوں نے میرا آپریشن کیا تھا) بھی جا چکے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے ہسپتال کے ریڈیو پر انہیں ڈھونڈنا شروع کیا۔ اتفاق سے جلدی ہی ان کی کار کے ریڈیو سے میرا رابطہ ہوا وہ شہر سے باہر جا رہے تھے۔ اگلے دو منٹ تک ان سے رابطہ نہ ہوتا تو وہ ریڈیو کے ریٹخ سے باہر نکل جاتے۔ تم انتہائی خوش قسمت ہو کہ ان سے رابطہ ان کے ریڈیو ریٹخ سے باہر نکلنے سے پہلے ہی ہوا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً ہی واپس آ کر آپ کو اس خطرناک صورت حال سے نکال لیا۔ اب آپ خطرے سے باہر ہیں۔

یقیناً صرف دو منٹ کا یہ قلیل وقفہ مجھے موت کے منہ سے واپس لے آیا تھا۔

الغرض مجھے زندگی میں ایک درجن سے زیادہ ایسے واقعات پیش آئے ہیں جب میری موت کے راستے میں کبھی کوئی پتھر کبھی ماہر پائلٹ کبھی چند انچ کے فاصلے اور کبھی چند منٹ کے وقفے حائل ہوتے رہے۔ قدرت کے یہ کام سمجھنے کے ہیں نہ سمجھانے کے۔



حصہ پنجم



کامیابی کی کسوٹی



کامیابی کی کسوٹی

قارئین کرام! آپ نے پچھلے صفحوں میں میری زندگی کے ابتدائی 52 سالوں کی سرگرمیوں اور کارکردگی کی تفصیلات پڑھیں۔ میری یہ زندگی کتنی کامیاب یا ناکام رہی ہے اس کا اصل اندازہ اور فیصلہ تو آپ لوگ اور کشمیر کی تاریخ (خاص کر تحریک آزادی کشمیر کی تاریخ) کریں گے۔ البتہ خود میں اپنی زندگی سے مجموعی طور پر خاصا مطمئن ہوں اور یہی اطمینان میری سب سے قیمتی متاع ہے۔

ہر شخص زندگی میں کامیابی یا ناکامی کو اپنی سوچ کے معیار سے تولتا ہے۔ کوئی دولت کو معیار بناتا ہے تو کوئی شہرت کو۔ کوئی اقتدار کو کامیابی گردانتا ہے تو کوئی زندگی کی ذہنی اور جسمانی آسائشوں کو۔ کوئی نیک نامی کو عظمت کی نشانی قرار دیتا ہے تو کوئی زہد و تقویٰ کو۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو انسان کی زندگی کو خدمت خلق کی کسوٹی پر پرکھ کر اسے کامیاب یا ناکام قرار دیتے ہیں اور میں اپنے آپ کو اسی سوچ کے حامل لوگوں میں شمار کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ تاریخ بھی کسی شخص کی کامیابی کو پرکھنے کے لئے یہی کسوٹی استعمال کرتی ہے۔

میری نظر میں کسی انسان کی زندگی کی کامیابی کی بنیادی کسوٹی یہ ہے کہ وہ کتنے لوگوں کو کتنا فائدہ پہنچاتا یا پہنچانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے یعنی جو شخص زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور دیرپا فائدہ پہنچائے یا پہنچانے کی بھرپور، مخلصانہ اور ہر ممکن کوشش کرے اس کی زندگی اسی تناسب سے کامیاب ہے اور اس شخص کی زندگی اور بھی زیادہ کامیاب ہے جو نامساعد ذاتی حالات کے باوجود اور ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور دیرپا فائدہ پہنچائے یا پہنچانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ میں جب اپنی اب تک کی زندگی کو کامیابی کی اس کسوٹی پر پرکھتا ہوں تو وہ مجموعی طور پر کامیاب نظر آتی ہے۔ آئیے اس سلسلے میں ذرا تفصیل میں جائیں۔

ڈھائی سال کی عمر میں یتیم ہو کر اور والد کی شفقت اور رہنمائی سے محروم ہونے کے بعد در در کی ٹھوکریں کھانے والا۔ سکول پہنچنے کے لئے دو سال تک روزانہ 18 کلومیٹر پیدل چلنے پر

مجبور۔ 75 پیسے کے قرض کی ادائیگی نہ کر سکنے پر گالیاں کھانے والا۔ کراچی جیسے شہر میں ابتدائی ایک سال تک صرف تیس روپے ماہوار آمدنی کا حامل اور کراچی ہی میں 1954ء میں چھ ماہ تک فٹ پاتھ پر سونے پر مجبور ہونے والا امان اللہ اگر تین عشروں کی جہد مسلسل کے ذریعہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ ریاست جموں کشمیر کے سوا کروڑ انسانوں اور ان کی آئندہ نسلوں کو قومی آزادی کی دولت سے مالا مال کرنے کے ضامن ایک انقلابی نظریے کی تبلیغ و تشہیر میں اہم ترین کردار ادا کرے اور اس نظریے کو عملی جامہ پہنانے کی عملی تحریک میں بھی اس کا کردار کلیدی ہو تو اس کی اس زندگی کو غالباً "کامیاب ہی قرار دیا جائے گا۔

میرے مشاہدے اور تجزیے کے مطابق میری زندگی کی کامیابی کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ (بجز ان حضرات کے جو مخصوص مفادات کے تحت میری کردار کشی کرتے رہے ہیں) جو لوگ مجھے ذاتی طور پر جانتے ہیں یا جنہیں میرے طرز فکر و عمل کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہیں، ان کے دلوں میں میری ذات کے لئے خاصا احترام ہے خواہ وہ نظریاتی طور پر میرے خلاف ہی کیوں نہ ہوں اور ظاہراً اور سیاسی مصلحتوں کے تحت مجھے برا بھلا ہی کیوں نہ کہتے ہوں۔ ممکن ہے میرے مخالفین میرے اس دعوے کو خود ستائی یا خود فریبی قرار دیں لیکن میں اس معاملے کے گہرے۔ غیر جانبدارانہ اور ناقدانہ تجزیے کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ چنانچہ میری ذات کے بارے میں یہ عام رائے بھی جو میری ایک اہم متاع ہے، میری زندگی کی کامیابی کا ایک اور ثبوت ہے گو اس کی نوعیت تحریک آزادی سے متعلق میری کامیابی کی نوعیت سے خاصی مختلف ہے۔

آج جب میں پیچھے مڑ کر اپنی زندگی پر ایک ناقدانہ نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اطمینان سا ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اگر کچھ مرحلوں پر مجھ سے کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں (جن میں سے اکثر کا میں غیر شعوری طور پر اور باقی کا غلط اندازے کی وجہ سے مرتکب ہوا) سرزد نہ ہوتیں تو میری کامیابیاں یعنی (Achievements) شاید کہیں زیادہ اور نسبتاً بڑی ہوتیں۔

میں جب اپنی زندگی کے اہم واقعات اور ان کے دوران اپنے طرز عمل کی روشنی میں اپنی کامیابیوں کی وجوہات کا تجزیہ کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ میری ان کامیابیوں میں میرے خلوص، منزل کے یقین، جہد مسلسل، خود اعتمادی، اخلاقی جرأت، کسر نفسی، ثابت قدمی، نامساعد حالات سے استفادہ کرنے کی عادت، رسک لینے کی جرأت، یقین محکم، قول و فعل میں ہم آہنگی، بلند نظری، خود احتسابی، دوسروں پر اعتماد کرنے کی عادت، میانہ روی اور میری قسمت کا ہاتھ سب سے زیادہ ہے۔ آئیے ذرا میری زندگی کی کامیابی میں ان عوامل کے انفرادی کردار پر قدرے تفصیلی نظر ڈالیں۔

خلوص -

اپنے مقصد، اپنے ذاتی اور سیاسی ساتھیوں اور دیگر متعلقہ لوگوں اور اپنے فرائض سے مخلص رہنا میرے کردار اور خمیر کا حصہ ہے اور شاید میری کامیابی کی سب سے بڑی وجہ بھی۔ کوئی شخص اگر ایک بار میرے کسی ذاتی یا تحریک سے متعلق کسی معاملے میں میری کوئی مدد کرے تو میں اس کے عوض اس کی طرف سے میرے ساتھ ہونے والی بہت سی زیادتیوں کو معاف یا نظر انداز کرتا ہوں۔ دوسروں کے احسانات کو آسانی سے نہیں بھولتا۔ اپنے اخلاقی اور منصبی فرائض کی ادائیگی میں میں کبھی شعوری طور پر کوتاہی نہیں کرتا۔ بد اخلاقی کا جواب بد اخلاقی یا الزام تراشی کا جواب الزام تراشی سے نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ عام طور پر الزام تراشی کا جواب ہی نہیں دیتا۔ اگرچہ میرے اس طرز عمل سے کچھ لوگوں نے انتہائی ناجائز فائدہ بھی اٹھایا جس کے نتیجے میں میری ذات، تنظیم اور تحریک کو نقصان بھی پہنچا چنانچہ میرے کچھ احباب میرے اس طرز عمل پر مجھ سے نالاں بھی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے اس طرز عمل کے فائدے اس کے نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں چنانچہ میں اپنی ان عادتوں کو اپنی متاع بے ہمت تصور کرتا ہوں۔

منزل کا تعین -

زندگی میں کسی مقصد یا منزل کے تعین کے بغیر انسان ایک بے مددگار اندھے انسان کی طرح ہوتا ہے جو ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہے۔ انسان کو اپنے قلیل المعیاد مقاصد اور پوری زندگی کے لئے ایک واضح منزل کا تعین کرنا چاہئے۔ اس سے انسان کی زندگی کو ایک واضح سمت ملنے کے علاوہ انسان میں آگے بڑھنے کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ میری کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اپنی نجی اور سیاسی زندگی میں اپنے لئے ایک واضح منزل کا تعین کیا۔ اس کے حصول کے لئے جدوجہد کی اور جدوجہد کے سلسلے کو ٹوٹنے نہیں دیا۔

مسلسل محنت -

مسلسل ذہنی اور جسمانی محنت کی عادت میری زندگی کا ایک اہم حصہ ہے اور میری زندگی کی کامیابی کی ایک اہم وجہ بھی۔ کوئی کام نہ ہو تو کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اپنے سکولوں کے قیام اور ان کی ترقی سے لے کر لبریشن فرنٹ اور اس کے نظریات کے پھیلاؤ تک کے پس منظر میں میری ذہنی اور جسمانی محنت کا حصہ نمایاں نظر آتا ہے۔ گو وقت گزرنے کے ساتھ محنت کی نوعیت بھی بدل گئی ہے اور میری سرگرمیوں میں ذہنی محنت کا عنصر جسمانی محنت پر پوری طرح غالب آ گیا ہے بہر حال محنت محنت ہے ذہنی ہو یا جسمانی، اور محنت کسی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔

جھوٹ سے احتراز۔ میں نے زندگی میں جھوٹ بولنے سے حتی الامکان احتراز کیا ہے۔ جھوٹ بولنا اخلاقیات کے منافی ہونے کے علاوہ انسان کے لئے عارضی فائدے کے بعد بڑے مسائل پیدا کرتا ہے کیونکہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے مزید دس جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں جھوٹ سے انسان دھوکہ دہی کا بھی مرتکب ہوتا ہے جو ایک بڑا اخلاقی جرم ہے۔ جھوٹ بولنے سے انسان دوسروں کا اعتماد بھی کھو دیتا ہے جو اسکے لئے عملی زندگی میں بڑی رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ جھوٹے انسان کو معاشرہ بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

ثابت قدمی۔ اپنی زندگی کے مشن، نظریات اور قلیل المعیاد پروگراموں پر ثابت قدم رہنا میرے کردار کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ نظریہ خود مختار کشمیر کو ہی لیجئے اس کا حامل اور مبلغ ہونے کی پاداش میں مجھے کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا لیکن انتہائی نامساعد حالات میں بھی میرے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ اپنے نظریات کی مخالف قوتوں کے سامنے جھکنے یا عارضی یا ذاتی مفادات کے عوض بکنا مہری لغت سے خارج ہیں۔ میرے طرز عمل کے اس پہلو پر بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح (جنہیں میں ان کے انتہائی مضبوط ذاتی کردار کی وجہ سے انتہائی احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں) کے اس قول کی گہری چھاپ ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سو بار سوچو لیکن فیصلہ کرنے کے بعد اس پر پوری طرح ثابت قدم رہو۔

خود اعتمادی۔ بچپن میں ہی پدرانہ شفقت، رہنمائی اور حوصلہ افزائی سے محرومی کے پیش نظر اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ میں شدید احساس کمتری کا شکار ہو جاؤں گا لیکن قدرت کی عطا کردہ ذہنی صلاحیتوں اور امتحانوں میں مسلسل اور غیر معمولی کامیابیوں نے مجھ میں خود اعتمادی پیدا کر دی جو جدوجہد بھری زندگی میں میری اہم مددگار ثابت ہوئی۔ خود اعتمادی انسان میں جرأت اور ذہنی طاقت پیدا کرتی ہے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی یعنی Over Confidence اکثر نقصان دہ ثابت ہونے کے علاوہ انسان کو متکبر اور مغرور بھی بنا دیتی ہے اور معاشرہ اور تاریخ مغرور انسان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

قوت برداشت۔ قدرت نے مجھے مضبوط قوت برداشت سے نوازا ہے، چنانچہ زندگی خاص کر سیاسی زندگی میں میری یہ دولت کام آتی رہی ہے۔ میرے سیاسی مخالفین مجھ پر طرح طرح کے بے بنیاد الزام لگا کر میری بدترین کردار کشی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تحریک آزادی کے نام پر جمع کی گئی رقوم بھی میری کردار کشی پر مبنی کتابچوں، رسالوں اور اخباری بیان

بازی پر صرف کرتے رہے۔ حکومتیں مجھے ناکروہ گناہوں کی سزا کے طور پر تختہ مشق بناتی رہیں۔ لیکن میں صبر سے کام لیتا رہا چنانچہ میرے مخالفین تھک ہار کر خاموش ہوتے رہے۔ میرا یہ یقین ایمان کی حد تک پختہ ہے کہ وقت سب سے بڑا جج ہے۔ وہ دیر سے ہی سہی بالاخر دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیتا ہے اور دوسروں پر بے بنیاد الزام تراشی کرنے والوں کو خاموش ہی نہیں کرتا انہیں مختلف سزائیں بھی دیتا ہے۔

وقت کے فیصلے سے متعلق اس حقیقت سے قطع نظریہ نفسیاتی حقیقت بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ مسلسل صبر سے انسان پر نفسیاتی اثر پڑتا ہے جس کے نتیجے میں وہ جرات سے محروم ہو کر بزدل بن جاتا ہے یہ بزدلی ایک حد سے آگے بڑھ جائے تو بے غیرتی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور معاشرہ اور تاریخ بزدل اور بے غیرت انسانوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

اخلاقی جرأت۔ میری زندگی کے مقاصد کی پاکیزگی، سازشی نوعیت کے طرز عمل سے مکمل پرہیز اور خود اعتمادی نے مجھ میں اخلاقی جرات پیدا کی ہے اور اخلاقی جرات انسان کے لئے کامیابی کی طرف کے سفر کے دوران قوت بخش زاد راہ ثابت ہوتی ہے۔

کسر نفسی۔ کسر نفسی یعنی اپنے آپ کو غیر ضروری طور پر بڑا نہ سمجھنا، میری شخصیت کا ایک جز ہے اور زندگی میں میری کامیابیوں میں اس کا بھی خاصا ہاتھ ہے۔ اس بارے میں بچپن میں پڑھے ہوئے اقبال کے اس شعر نے میری رہبری کی کہ ”مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے۔ کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے“ میرے کچھ دوست میری منکسر المزاجی اور کسر نفسی پر بھی نالاں ہیں اور انہیں ان کے نفسیاتی اثرات کے پیش نظر دور حاضر کے عملی رجحانات کے منافی قرار دیتے ہوئے مجھے اس طرز عمل کو خیر باد کہنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس طرز عمل کے بھی فائدے اس کے نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں۔ البتہ کسر نفسی، احساس کمتری اور معذرت خواہانہ طرز عمل میں فرق کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کیونکہ ان تین طرز ہائے عمل میں بہت کم فرق ہونے کے باوجود جہاں کسر نفسی انسان کو دوسروں کی نظروں میں اونچا کر دیتی ہے وہاں احساس کمتری اور معذرت خواہانہ طرز عمل انسان کو جی حضوری اور چالپوس بنا دیتے ہیں اور انسان کی یہ دونوں خامیاں عارضی اور چھوٹی نوعیت کے فوائد کی حامل ہونے کے باوجود انسان کی شخصیت کو مسخ کر دیتی ہیں اور کسی کی شخصیت مسخ ہونا اس کے لئے ایک سانحہ سے کم نہیں۔

مشکلات سے استفادہ -

ایک مشہور دانشور کا قول ہے کہ انسان چاہے تو بدترین حالات سے بھی بہترین فائدہ اٹھا سکتا ہے چنانچہ میں بھی اس قول پر عمل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ مجھ پر جب بھی کوئی مشکل آن پڑی میں اپنی قسمت یا دوسروں کو کوسنے کی بجائے اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرنے کے علاوہ اس سے استفادہ کرنے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔ میری زندگی کی بہترین تحریر میرے قلم سے 1971ء میں شاہی قلعہ لاہور میں میری پُر عذاب اسیری کے دوران نکلی جس کی تفصیل اس کتاب کے متعلقہ باب (شاہی قلعہ لاہور میں سات ہفتے) میں بیان کی گئی ہے۔ ستمبر 1985ء میں برطانوی حکومت نے بھارتی دباؤ کے تحت اور بے بنیاد الزامات لگا کر مجھے گرفتار کیا اور دہشت گردوں کے لئے مخصوص اور انتہائی اذیت ناک ماحول والے جیل میں قید رکھا۔ لیکن میں نے اپنے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کو اپنے ذہن اور دل پر مسلط ہونے نہیں دیا بلکہ اسے ذہن سے ہی اُتار پھینکا اور اپنی اس بے جواز اسیری کو تحریک آزادی کے لئے اپنی قربانی تصور کر کے اس سے اطمینان قلب حاصل کرتا رہا اور اس طرح ملنے والے ذہنی سکون سے استفادہ کرتے ہوئے میں نے ایک کتاب (خود مختار کشمیر کیوں؟) لکھنے کے علاوہ بہت سی اچھی کتابیں پڑھ ڈالیں جس سے میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ فرصت کے اوقات میں بی بی سی ریڈیو کے معلوماتی پروگرام سننے سے میری معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔ وسیع معلومات انسان میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور بحث مباحثوں کے دوران اسے مجلس میں ایک اعلیٰ مقام دلانے کے علاوہ اس کی شخصیت میں بھی نکھار لاتی ہیں۔ برطانیہ میں پندرہ ماہ کی اسیری کے دوران میں نے حالیہ تاریخ عالم کے علاوہ دنیا کی عظیم ہستیوں کی سوانح عمریاں بھی پڑھیں جس سے مجھے ان عظیم ہستیوں کے طرز فکر و عمل کا اندازہ ہوا۔ چنانچہ جب میں کسی مشکل میں پھنس جاتا ہوں تو سوچتا ہوں اگر فلاں عظیم ہستی ایسے حالات سے دوچار ہو جاتی تو اس کا طرز عمل اور رد عمل کیا ہوتا۔ اس طرح مجھے اس مشکل پر قابو پانے میں مدد اور رہنمائی ملتی ہے۔ یہ ہیں مشکلات اور نامساعد حالات سے استفادہ کرنے کے کرشمے۔ اگر میں برطانیہ کی جیلوں اور شاہی قلعہ لاہور میں اپنی اسیری کے دوران اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں پر ہی کڑھتا رہتا تو یہ اسیریاں میرے لئے عذاب جان بن جاتیں جبکہ ان نا انصافیوں سے استفادہ کرنے کے میرے طرز عمل سے مجھے گوناگوں فائدے ہوئے اور میں ذہنی عذاب سے بھی بچا۔

رِسک لینا -

میں نے زندگی میں بے شمار رِسک (Risk) لئے ہیں اور ان میں تقریباً 80 فیصد کامیاب رہا ہوں۔ چنانچہ زندگی میں میری کامیابیوں کی ایک وجہ میری یہ عادت بھی ہے۔ اگرچہ مجھ میں یہ عادت بچپن سے ہی تھی لیکن اسے میرے طرز عمل کا حصہ بنانے میں روزنامہ ڈان کراچی کی پیشانی پر کئی سال تک روزانہ شائع ہونے والے مقولے "Those only

”live who dare“ یعنی دنیا میں وہی لوگ (صحیح معنوں میں) زندہ رہتے ہیں جو جرأت سے کام لیتے ہیں“ کا بڑا ہاتھ ہے۔

یقین محکم۔ اپنے مقصد، پروگرام اور مشن کی صداقت اور ان کے حصول کے امکان پر انسان کا یقین اس میں خود اعتمادی، مقصد کے حصول کی لگن اور محنت کا جذبہ پیدا کرتا ہے جس سے مقصد کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔ میری زندگی میں کامیابی کافی حد تک میرے اس طرز فکر کی بھی مرہون منت ہے۔

قول و فعل میں ہم آہنگی۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ میرے قول و فعل میں ہی نہیں ظاہر و باطن میں بھی مکمل ہم آہنگی رہے۔ انسان کے اس طرز عمل سے دوسروں کے دلوں میں اس کے لئے عزت و احترام ہی نہیں اعتماد بھی پیدا ہو جاتا ہے اور یہ عزت و احترام اور دوسروں کا اعتماد انسان کے لئے ایک قیمتی متاع ثابت ہوتے ہیں۔

بلند نظری۔ 1950ء میں میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی کے بعد بلند نظری میری سوچ اور کردار کا حصہ بن گئی چنانچہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی میں نے بلند نظری کا دامن نہیں چھوڑا چنانچہ کبھی کبھی میری یہ بلند نظری شیخ چلی کے خیالات کی سرحدوں کو چھوئے لگتی تھی۔ علاوہ ازیں حالات بھی مجھے اس سمت میں دھکیلتے رہے۔ صرف پندرہ روپے کے سرمائے سے سکول قائم کرنے پر مجبور ظاہراً حالات نے کیا لیکن اس کے پس منظر میں میری بلند نظری کارفرما تھی ورنہ میں سٹی ٹائٹ سکول کے ہیڈ ماسٹر کے ریمارکس کے رد عمل کے طور پر ایسا قدم اٹھانے کی بجائے خاموشی اختیار کرتا۔ اسی طرح اپنے سکولوں کے منافع بخش ہوتے ہی اپنا بینک بیلنس یا جائیداد بنانے کی بجائے میں نے ایک نظریاتی ماہنامہ (وائس آف کشمیر) جاری کیا حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ نظریاتی رسالے مالی اور ذہنی طور پر انسان کا خون چوستے ہیں۔ سیاسی میدان میں عملی قدم رکھتے ہی میں نے ذاتی منفعت والی سیاست کی بجائے بلند نظری پر مبنی نظریاتی سیاست کا کانٹوں بھرا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ بلند نظری پر مبنی اپنے ان اقدامات کی بدولت میرے لئے کامیابی کے بہت سے راستے کھل گئے۔

بلند نظری کے درج بالا روشن پہلو سے قطع نظر، اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ جہاں انسان کی نظر آسمان پر ہونی چاہئے وہاں پاؤں زمین پر ضرور ہونے چاہئیں (یعنی عملی حقائق کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے) ورنہ انسان ہوا میں لٹک جاتا ہے۔

خود احتسابی۔ جس طرح مملکت کی بقاء کے لئے فوج اور پولیس ایک بنیادی ضرورت ہوتی ہے تاکہ فوج مملکت کو بیرونی خطرات سے محفوظ رکھے اور پولیس اندرونی طور پر امن و امان قائم رکھے اسی طرح انسان کے لئے خود احتسابی (اپنے فکر و عمل کا محاسبہ کرنا) ضروری ہے تاکہ وہ اپنے غلط اقدامات یا غلط سوچ کے نتیجے میں ہونے والے بیرونی حملوں سے بھی محفوظ رہے اور کج روی (غلط کاموں) سے بھی بچا رہے۔ خود احتسابی کی عادت نے مجھے بارہا بڑے بڑے بیرونی اور اندرونی خطروں سے بچایا ہے۔ خود احتسابی کا طریقہ یہ ہے کہ انسان وقفہ وقفہ سے انصاف اور اخلاقی قدروں کی روشنی میں اور اپنے مشن کے مفادات کو مد نظر رکھ کر اپنے طرز فکر و عمل کا تجزیہ کرے اور جہاں کہیں کوئی خامی نظر آئے اسے فوراً دور کرے۔

دوسروں پر اعتماد۔ انسان کو دوسروں سے تعلقات اور برتاؤ کے سلسلے میں پولیس افسر کی بجائے جج کا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ پولیس افسر اس وقت تک کسی ملزم کو بے قصور تسلیم نہیں کرتا جب تک اس پر لگا ہوا الزام غلط ثابت نہ ہو جبکہ جج کسی ملزم کو اس وقت تک مجرم تصور نہیں کرتا جب تک اس پر لگا ہوا الزام سو فیصد صحیح ثابت نہ ہو بلکہ شک کا فائدہ بھی ملزم کو ہی دیتا ہے۔ میں دوسروں سے تعلقات، ان سے برتاؤ اور ان پر اعتماد کے سلسلے میں جج کے متذکرہ بالا طرز فکر پر کاربند رہا ہوں۔ گو میرے اس طرز عمل سے میری ذات، تنظیم اور تحریک کو کئی بار نقصان بھی پہنچا ہے اور میرے اس طرز عمل پر میرے بہت سے احباب بھی مجھ سے ٹاللاں رہے ہیں لیکن جب میں اس طرز عمل کے عارضی نقصانات اور دیر پا فوائد کا موازنہ کرتا ہوں تو فوائد کا پلڑا بہت بھاری نظر آتا ہے۔

میانہ روی۔ انگریزی کا ایک فلسفیانہ مقولہ ہے There is no universal truth except that every truth is half true. یعنی دنیا میں ایسی کوئی سچائی نہیں جسے ہر دور

میں ہر جگہ اور ہر طبقے نے سچائی تسلیم کیا ہو۔ بجز اس سچائی کے کہ ہر سچائی نیم سچائی ہوتی ہے۔ عام زبان میں اس مقولے کو یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ ایک طرز فکر و عمل ایک جگہ، ایک دور میں اور ایک طبقے میں معیوب تصور ہوتا ہے جبکہ وہی طرز فکر و عمل دوسری جگہ دوسرے دور میں یا دوسرے طبقے میں قابل تحسین مانا جاتا ہے۔ ماضی میں حقائق پر پردہ ڈالنے، معاملات کے ایک ہی پہلو کو اجاگر کرنے اور قول و فعل اور ظاہر و باطن میں ہم آہنگی کے فقدان کو ایک ناپسندیدہ طرز عمل گردانا جاتا تھا جبکہ آج یہی طرز عمل اچھی حکمت عملی، کامیاب ڈپلومیسی اور کامیاب سیلز مین شپ (Salesmanship) تصور ہوتا ہے۔ معاشرے کا ایک طبقہ معاشرے کو ماضی کی قدروں کے تابع کرنا چاہتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ اسے رجعت پسندی قرار دے کر معاشرے

کو ترقی پسندی اور جدیدیت کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی طرح مغرب والوں کی نظر میں مشرقی قدریں دقیاوسی طرز فکر و عمل کی آئینہ دار ہیں جبکہ مشرق والے یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب انسان کو حیوانیت کی طرف لے جا رہا ہے۔

ماضی اور حال۔ معاشرے کے مختلف طبقوں اور مشرق و مغرب کے مابین اس فکری ٹکراؤ کی پیچیدہ صورت حال کے پیش نظر ارفعہ مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروف ایک مشرقی انسان کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ میانہ روی یعنی درمیانی راستہ اختیار کرے۔ رجعت پسندی اختیار کرنا یا الٹرا ماڈرن (Ultra modern) بننا اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

مناسب معلومات - انگریزی کا ایک مقولہ ہے (One must know some thing about every thing and every thing about some thing) یعنی انسان کو

ہر چیز کے بارے میں کچھ معلومات رکھنی چاہئیں اور کسی چیز کے بارے میں تمام معلومات ہونی چاہئیں۔ انسان کی معلومات اسکی عملی زندگی میں اسکے بڑے کام آتی ہیں۔ میری خوش قسمتی کہ حالات نے مجھے طالب علمی کے زمانے میں بہت سے اہم مضمون پڑھنے پر مجبور کیا چنانچہ میٹرک تک اردو۔ فارسی۔ تاریخی۔ جغرافیہ اور حساب، ایف ایس سی میں سائنس، بی اے میں سیاسیات اور عالمی تاریخ۔ ایل ایل بی میں قانون ایم اے میں بین الاقوامی تعلقات اور ایم پی اے معاشیات جیسے اہم مضامین پڑھے۔ ابتدائی اسلامی تعلیم گھر پر ہی پڑھی جبکہ اسلام کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ عملی زندگی میں آنے کے بعد کیا۔ دوسرے مذاہب کا بھی مطالعہ کیا۔ البتہ عملی زندگی میں میرا اہم ترین موضوع مسئلہ کشمیر رہا ہے جس کے بارے میں میں نے خاصا پڑھا ہی نہیں بلکہ اب تک میں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک کتاب تقریباً ڈیڑھ درجن کتابچے اور سینکڑوں مضامین لکھے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں پڑھے ہوئے سارے مضامین سے مجھے عملی زندگی میں بڑی مدد ملی میں نے انسانی نفسیات سے متعلق کچھ کتابیں بھی پڑھی ہیں چنانچہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کام آنے والے ان مضامین کے سرسری مطالعے اور مسئلہ کشمیر کے تفصیلی مطالعے نے میری نجی اور سیاسی زندگی میں میری بڑی مدد کی ہے۔

قسمت - میں ”قسمت“ اور ”تقدیر“ کی اصطلاحوں کے بارے میں کچھ مولوی صاحبان کے اس استدلال یا تشریح سے اتفاق نہیں کرتا کہ انسان کی حیثیت خدا یا قدرت کے ہاتھ میں ایک قیدی یا کٹھ پتلی کی سی ہے اور یہ کہ انسان کی زندگی کا ہر واقعہ پہلے سے ہی مقرر شدہ ہے۔ اس بارے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ انسان بڑی حد تک خود مختار ہے اور اپنی زندگی

بنانے اور بگاڑنے اور اس کی سمت کا تعین کرنے میں بڑی حد تک آزاد ہے البتہ یہ بات بھی یقینی ہے کہ انسان کی زندگی پر وہ معاملات بھی خاصی حد تک نظر انداز ہوتے ہیں جن پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ بیرونی عوامل انسان کی زندگی کو مختصر یا طویل کرنے، اسے کامیاب یا ناکام بنانے اور اس کی سمت تعین کرنے میں بھی خاصا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ”واقعات جنہوں نے میری زندگی کے رخ موڑ دیئے“ اور ”.... اور میں موت کے منہ سے واپس آتا رہا“ کے عنوانوں کے تحت درج واقعات ایسے ہیں جن میں سے اکثر پر میرا کوئی کنٹرول نہیں تھا لیکن ان میں سے کچھ نے میری جان بچائی اور کچھ نے میری زندگی کے رخ مثبت سمت میں موڑ دیئے۔ اسی طرح یہ بات میرے بس میں نہیں تھی کہ میں ڈھائی سال کی عمر میں یتیم ہو کر شفیق والد کے سائے سے محروم ہونے سے بچ سکوں۔

اگر آپ ان واقعات اور عوامل کو جو آپ کے کنٹرول میں نہیں ہیں لیکن آپ کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں قسمت یا تقدیر کا نام دیتے ہیں تو قسمت واقعی انسانی زندگی پر خاصی اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ ”کسی کا ایک آنسو بھی ثریا کو رلاتا ہے۔ کسی کا عمر بھر رونا یونہی برباد جاتا ہے۔“ البتہ اگر انسان اپنے دل، ذہن اور تجربے کا صحیح استعمال کرے تو اپنے آپ پر بیرونی عوامل کے اثر کو کم کر سکتا ہے لیکن ان سے بالکل بچے رہنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

الغرض قسمت کی میری درج بالا تشریح کی روشنی میں میرا اپنے آپ کو خاصا خوش قسمت سمجھنا بے جا نہ ہو گا کیونکہ بیرونی عوامل میرے لئے نقصان دہ ثابت ہونے سے کہیں زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ میری اس خوش قسمتی نے بھی میری زندگی کی کامیابی میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔

دیگر عوامل۔ انسانی زندگی میں اس کی کامیابی کے درج بالا عوامل کے علاوہ اور بھی عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن میں وسعت قلبی، وسیع النظری، فیاضی، انصاف پسندی، ترس، ملنساری، دھوکہ دہی اور بددیانتی سے احتراز، خود داری اور زندہ دلی وغیرہ شامل ہیں۔

ایک اہم خدشہ۔ اگر میانہ روی کے درج بالا عنوان کے تحت درج فلسفیانہ انگریزی مقولے کو انسانی زندگی کی کامیابی کے عوامل پر لاگو کیا جائے تو اس بات کا احتمال نظر آتا ہے کہ انسانی زندگی کی کامیابی کی یہ چابیاں عارضی ہیں اور ان کی یہ افادیت جلدی ختم ہو جائے گی لیکن اگر ہم مشرقی معاشرے میں قدروں کی تبدیلی کی رفتار، ان چابیوں کی مضبوط نوعیت اور مشرقی معاشرتی فکر کے رجحانات کا گہرا تجزیہ کریں تو پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی کامیابی کی یہ چابیاں کم از کم آئندہ ایک صدی تک اپنا یہ کردار ادا کرتی رہیں گی اور ان میں سے

کچھ تو آئندہ ہزاروں سال تک انسان کے لئے کامیابی کے دروازے کھولتی رہیں گی بشرطیکہ انسانی زندگی کی کامیابی کی کسوٹی وہی ہو جس کی تشریح میں نے اس باب کے شروع میں کی ہے۔ کامیابی کی نوعیت کے دوسرے تصورات کے لئے ان میں سے اکثر عوامل غیر فائدہ مند ہی نہیں نقصان دہ بھی ہیں۔

یہ تھا ان عوامل کا کسی حد تک تفصیلی ذکر اور تجزیہ جو ارفع مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروف انسانوں کے لئے منزل تک پہنچنے کی جملہ ضروریات کا کام دیتے ہیں۔ میرا یہ تجزیہ سنی سنائی بات نہیں بلکہ میرے ذاتی اور عملی تجربے کا نچوڑ ہے۔ میں نے ان عوامل کا ذکر اپنے حوالے سے کر کے خودستائی کے الزام کا خطرہ بھی اسلئے مول لیا ہے کہ یہ عوامل اور میرا یہ تجزیہ دوسروں کے لئے مشعل راہ بن جائے۔ جبکہ ذاتی تجربے کا حوالہ دیئے بغیر کامیابی کے عوامل کا تذکرہ پسند و نصح کا ایک خشک اور غیر دلچسپ سا مضمون بن جاتا۔ مجھے امید ہے قارئین کرام خاص کر نوجوان اس سے مناسب استفادہ کریں گے۔

امان اللہ خان

امان اللہ خان

Handwritten text at the top left of the page.

Handwritten text in the upper middle section of the page.

Handwritten text in the middle section of the page.



Handwritten text and possibly a signature or date located to the right of the central emblem.

حصہ ششم



ریاست سے متعلق کچھ اہم موضوعات



پہلا باب

آزاد کشمیر کے پہلے انتخابات

اگرچہ میں 1955ء سے ہی کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے تحریک آزادی کشمیر سے وابستہ ہو گیا تھا لیکن میں نے تحریک آزادی اور نظریہ خود مختار کشمیر میں عملی حصہ لینا 1961ء میں ہونے والے آزاد کشمیر کے پہلے انتخابات سے شروع کیا۔

اکتوبر 1947ء میں آزاد گورنمنٹ کے قیام سے 1961ء تک آزاد کشمیر پر آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے دستانے کے اندر چھپا ہوا وزارت امور کشمیر کا ہاتھ حکومت کرتا رہا۔ مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ عملاً پاکستان کی وزارت امور کشمیر کی طرف سے نامزد کی گئی ہوتی تھی اور وزارت امور کشمیر اپنی بنائی ہوئی اسی مجلس عاملہ سے اپنی پسند کے شخص کو آزاد کشمیر کا صدر نامزد کراتی تھی۔ یہ صورت حال آزاد کشمیر کے جمہوریت پسند حلقوں کے لئے خاصی پریشان کن تھی اور اس کے خلاف اکثر آوازیں اٹھتی رہتی تھیں۔

1961ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاکستان میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام نافذ کیا تو مناسب سمجھا گیا کہ آزاد کشمیر میں بھی اسے نافذ کیا جائے اور آزاد کشمیر کی صدارت کو کچھ جمہوری شکل دی جائے۔ چنانچہ 1961ء میں پہلی بار آزاد کشمیر کے صدر کے انتخاب کے لئے مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کی بجائے عوام کی طرف سے منتخب 2400 ممبران بنیادی جمہوریت پر مشتمل الیکٹورل کالج (Electoral College) بنا۔ ان 2400 میں سے بارہ سو آزاد کشمیر، چھ سو مہاجرین صوبہ جموں مقیم پاکستان اور باقی چھ سو مہاجرین صوبہ وادی کشمیر مقیم پاکستان کی طرف سے منتخب ہونے تھے۔ 2400 ممبران جمہوریت کو آزاد کشمیر کے صدر کے علاوہ ایک بارہ رکنی سٹیٹ کونسل بھی منتخب کرنی تھی، جن میں سے چھ آزاد کشمیر سے، تین صوبہ جموں اور تین صوبہ وادی کشمیر کے مہاجرین میں سے منتخب ہونے تھے۔ آزاد کشمیر کی صدارت کے عہدے کے لئے پانچ اصحاب یعنی جناب کے ایچ خورشید (جو اس وقت آزاد کشمیر کے صدر تھے) سردار عبدالقیوم خان، پیر علی جان شاہ، خواجہ غلام بنی گلکار اور مسٹر داؤد امیدوار تھے۔ ان امیدواروں میں سے خواجہ غلام بنی گلکار کے منشور میں پوری ریاست جموں کشمیر کی مکمل خود مختاری نمایاں طور پر شامل تھی۔

1960ء تک کراچی میں کشمیری مہاجرین (ان دنوں کراچی میں آزاد کشمیر کے بہت کم لوگ تھے) کے سیاسی ذہن رکھنے والے اکثر لوگوں سے میرے ذاتی تعلقات قائم ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت سے نظریہ خود مختار کشمیر کے حامی تھے۔ چنانچہ ہم نے اپنا ایک الگ گروپ بنایا اور فیصلہ کیا کہ ہم ووٹ خود مختار کشمیر کے منشور والے خواجہ غلام نبی گلکار کو دیں گے۔ گو ہمیں گلکار صاحب کے جیتنے کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی لیکن ہم چاہتے تھے کہ ان کی امیدواری کے ذریعہ نظریہ خود مختار کشمیر کی پلٹی ہو۔ گو ان انتخابات میں میرا ووٹ نہیں تھا لیکن میں انتخابات سے متعلق سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتا رہا۔ ہم نے ایک اجلاس میں سیٹ کونسل کے لئے وادی کشمیر کی سیٹ پر جی ایم لون کا نام تجویز کیا لیکن انہوں نے انتخابات میں حصہ لینے سے انکار کیا چنانچہ خواجہ غلام محی الدین بانکا کو گروپ کا امیدوار کھڑا کیا گیا اور انہیں کانغذات نامزدگی داخل کرنے کے لئے لاہور روانہ کیا گیا۔ لیکن دوسرے دن چند افراد نے جی ایم لون کو کانغذات نامزدگی داخل کرنے لاہور بھیج دیا۔ چنانچہ بانکا صاحب نے اپنے کانغذات نامزدگی داخل کرنے کے بعد اپنا نام واپس لے لیا۔ اس صورت حال سے مجھے بہت دکھ ہوا۔ اجلاس میں خود میں نے لون صاحب کا نام پیش کیا تھا۔ لون صاحب کے انکار پر ہی بانکا صاحب کو امیدوار بنایا گیا تھا۔ لیکن بعد میں کچھ لوگوں نے لون صاحب سے اس فیصلے کی خلاف ورزی کرائی۔ اس افسوس اور چند دوسری وجوہات کی بنا پر میں نے سیٹ کونسل کے انتخاب کے سلسلے میں محمد اسحاق صاحب کی حمایت کی جس سے کچھ دوست مجھ سے ناراض بھی ہو گئے۔ سیٹ کونسل کے انتخابات میں وادی کشمیر کے حلقے سے سب سے زیادہ ووٹ لینے والے تین امیدواروں کو منتخب ہونا تھا۔ چنانچہ اس حلقے سے کراچی سے تعلق رکھنے والے دونوں امیدوار یعنی جی ایم لون اور محمد اسحاق اور راولپنڈی سے تعلق رکھنے والے منظور الحق ڈار سب سے زیادہ ووٹ لے کر کامیاب ہو گئے۔ خواجہ غلام نبی گلکار کو صرف 29 ووٹ ملے جن میں سے 17 کراچی والوں کے تھے۔ کراچی کی حد تک ان انتخابات کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست کی مکمل خود مختاری کے حامی افراد جی ایم لون غلام محی الدین بانکا، ملک عبدالرشید، غلام محمد پہلوان، غلام احمد بٹ، ڈاکٹر عبدالغنی، عبدالاحد راٹھور، رشید شاہ، حبیب اللہ رشتی، محمد صدیق، عبداللہ خان وغیرہ پر مشتمل ایک مضبوط گروپ وجود میں آیا۔ میں بھی اس گروپ کا ایک سرگرم رکن بن گیا۔ انتخابات کے دوران میر عبدالقیوم، خواجہ عطاء اللہ، میر عبدالمنان وغیرہ نے ووٹ کے بیج خورشید کو دیئے تھے۔ بعد میں یہ لوگ بھی ہمارے گروپ میں شامل ہو گئے اس طرح آزاد کشمیر کے ان انتخابات نے آزاد کشمیر کو جمہوریت کی منزل کی طرف گامزن کرانے کے علاوہ نظریہ خود مختار کشمیر کے حامی منتشر افراد کو یکجا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا اور میں بھی تحریک آزادی اور نظریہ خود مختار کشمیر سے پوری طرح منسلک ہو گیا۔

دو سرا باب

موئے مبارک کی چوری

سری نگر کے قریب درگاہ حضرت بل میں نبی اکرم صلی اللہ علی وآلہ وسلم کی داڑھی کا ایک موئے مبارک محفوظ ہے اور کشمیری مسلمانوں کو سال میں چار پانچ بار اس کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ اس زیارت کے لئے لاکھوں کشمیری وادی کے کونے کونے سے جمع ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت بل کشمیری مسلمانوں کے اتحاد کے لئے ایک اہم مرکز کا بھی کردار ادا کرتا ہے۔

26 اور 27 دسمبر 1963ء کی درمیانی رات کو یہ موئے مبارک چوری ہو گیا اور صبح یہ خبر پوری وادی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ انتہائی سردی اور بر فباری کے باوجود گھروں سے باہر نکل آئے اور سری نگر کی سڑکیں ماتم کرنے والوں سے بھر گئیں اور شمس الدین کھ کی حکومت آنا فانا مفلوج ہو گئی اور عنان حکومت عملاً ماتم کرنے والوں نے سنبھالی اس صورت حال سے بھارتی حکومت کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں۔ موئے مبارک کی چوری کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ یہ حرکت بھارتی حکومت کی تھی جس کا مقصد ریاستی مسلمانوں کو ان کے ایک اہم مرکز سے محروم کر کے منتشر کرنا تھا۔ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ حرکت بخشی غلام محمد نے کرائی ہے جسے کچھ مدت پہلے ہی بھارت کی مرکزی حکومت نے ریاست کے وزیراعظم کے عہدے سے ہٹایا تھا۔ بہر حال واضح حقیقت یہ تھی کہ اس کے نتیجے میں ریاستی حکومت اور ریاست میں سرگرم مرکزی ادارے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔

موئے مبارک کی چوری کے خلاف آزاد کشمیر و پاکستان میں بھی شدید رد عمل ہوا۔ جگہ جگہ مظاہرے ہوئے۔ کراچی میں ہم نے پہلے دن دفعہ 144 توڑ کر ایک بڑا مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرے کو منظم کرنے میں ہمارا خود مختار کشمیر گروپ پیش پیش تھا۔ بڑے مظاہرے کے بعد ہم نے 22 دن تک مسلسل مظاہرے کئے دوسرے لوگ تو باری باری مظاہرے میں شامل ہوتے تھے البتہ میں اور میر عبدالقیوم روزانہ اس میں شامل ہوتے رہے۔

موئے مبارک کی گمشدگی کے کئی روز بعد سری نگر سے اعلان ہوا کہ موئے مبارک مل گیا۔ اس پر کچھ لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کیں کہ ملنے والا موئے مبارک نقلی ہے۔ بہر حال

بعد میں حضرت بل کے متعلقہ لوگوں نے تصدیق کی کہ ملنے والا موئے مبارک نقلی نہیں اصلی ہے۔ البتہ بھارتی اور ریاستی حکومت نے آج تک اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا کہ موئے مبارک کی چوری کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ چوری کس شخص نے کی تھی اور یہ کہاں سے بازیاب ہوا۔

موئے مبارک کی چوری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کے ریاستی سیاست اور اس کے بارے میں بھارت کے اندازوں پر گہرے اثرات پڑے۔ اولاً "بھارتی حکومت نے پوری طرح محسوس کیا کہ کشمیری مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانا آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ ثانیاً "شمس الدین کٹھ کو وزارت عظمیٰ سے ہٹا کر جی ایم صادق کو ریاست کا وزیراعظم بنایا گیا۔ ادھر مولوی فاروق اپنی کم سنی کے باوجود اچانک کشمیر کے سیاسی افق پر پوری طرح نمودار ہو گئے۔ مولانا مسعودی کی منصوبہ بندی میں مہارت کو سب نے محسوس کیا اور بھارتی حکومت شیخ محمد عبداللہ کو جو گیارہ سال سے قید تھے غیر مشروط طور پر رہا کرنے پر مجبور ہو گئی۔ شیخ صاحب کی رہائی کے بعد بھارتی وزیراعظم نے انہیں پاکستان بھیجنا تاکہ مسئلہ کشمیر کو حتمی طور پر حل کرنے کے سلسلے میں صدر ایوب خان سے بات کریں۔ شیخ صاحب اور صدر ایوب کی بات چیت کے نتیجے میں مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے بھارت اور پاکستان کی سربراہی کانفرنس بلانے پر اتفاق رائے ہو گیا لیکن شیخ صاحب کے دورہ پاکستان کے دوران ہی بھارتی وزیراعظم پنڈت نہرو کا اچانک انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے سربراہی کانفرنس نہ ہو سکی نہ ہی پنڈت نہرو کے جانشینوں نے اس طرف کوئی توجہ دی۔



تیسرا باب

شیخ محمد عبداللہ

کچھ دلچسپ اور حیران کن واقعات و حقائق

بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی کے پہلے عشرے کے دوران ریاست جموں کشمیر میں یکے بعد دیگرے بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا بعد کے حالات پر گہرا اثر پڑا۔ ان واقعات میں گلشنی کمیشن کا قیام۔ 13 جولائی 1931ء کا واقعہ اور 1932ء میں مسلم کانفرنس اور 1934ء میں ریاست کے لیے قانون ساز اسمبلی کا قیام اور 1939ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنا شامل تھے لیکن جس معاملے نے ریاست کی بعد کی تاریخ پر سب سے گہرا اثر ڈالا وہ شیخ محمد عبداللہ کا سیاسیات کشمیر میں اہم ترین حیثیت حاصل کرنا تھا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کشمیریوں خاص کر اہل وادی کو بدترین احساس کمتری سے نکال کر ان میں خاصی خود اعتمادی پیدا کرنے۔ انہیں سیاسی شعور دینے اور انہیں ڈوگرہ شخصی راج اور آمریت کے خلاف سیاسی میدان میں سینہ سپر ہونے کے قابل بنانے میں شیخ صاحب کا کردار انتہائی اہم تھا لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اتنی ہی ناقابل تردید ہے کہ ریاستی عوام گذشتہ چار عشروں سے جن مصائب اور محکومی میں مبتلا ہیں ان کی ذمہ داری بھی سب سے زیادہ شیخ صاحب پر ہی عائد ہوتی ہے۔ کشمیریوں کی جدوجہد آزادی میں شیخ صاحب کے ان دو متضاد کرداروں سے متعلق تفصیلات اس کتاب کا موضوع نہیں البتہ کچھ ایسے واقعات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جن کا میں خود عینی شاہد ہوں اور جو شیخ صاحب کی شخصیت اور ان کے طرز عمل کی عکاسی کرتے ہیں۔

میں 1951ء میں ایس پی کالج سری نگر کا طالب علم تھا اور مجھے ذاتی حالات نے اس نتیجے پر پہنچا دیا تھا کہ مجھے پاکستان منتقل ہو جانا چاہئے۔ اس دوران پاکستان آنے کے لئے ریاستی حکومت کی وزارت داخلہ پاس جاری کرتی تھی۔ بخشی غلام محمد وزیر داخلہ تھے۔ میں بخشی صاحب سے ملا تو انہوں نے پاس جاری کرنے سے صاف انکار کر دیا اس کے بعد اگست 1951ء میں ایک

دن میں شیخ صاحب سے ملنے ان کی رہائش گاہ پر گیا۔ شیخ صاحب وزیر اعظم تھے انہوں نے پاکستان منتقل ہونے کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا میں حد متارکہ جنگ کی دوسری طرف کے علاقہ استور گلگت کا رہنے والا ہوں اور یہاں میرے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے والا کوئی نہیں انہوں نے کہا میٹرک کس ڈویژن میں پاس کیا ہے میں نے کہا فرسٹ ڈویژن میں۔ اس پر انہوں نے دوسرے دن مارکس شیٹ لا کر انہیں دکھانے کے لئے کہا۔ دوسرے دن میں مارکس شیٹ لے کر شیخ صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ لان میں بیٹھے تھے اور بہت سے بھارتیوں سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے گیٹ پر کھڑے دیکھ کر بلایا میں نے مارکس شیٹ دکھائی تو کہنے لگے اچھا فرسٹ ڈویژن ہے میں نے کہا جناب میں نے فرسٹ ڈویژن ہی نہیں لی بلکہ یونیورسٹی بھر میں مسلمان طلباء میں اول آیا ہوں انہوں نے پھر کہا فرسٹ ڈویژن لی ہے تو میں نے اپنا جواب پھر دہرایا اس پر شیخ صاحب نے گرج کر کہا۔ شٹ اپ میں یہ بکواس سننا نہیں چاہتا۔ جاؤ پاس کے بارے میں تمہیں کالج میں جواب ملے گا۔ چنانچہ میں وہاں سے چلا آیا۔ چند دن بعد پتہ چلا کہ میرے لئے پاس کی بجائے دو سو روپے کی گرانٹ منظور ہوئی ہے۔

دراصل شیخ صاحب وہاں موجود بھارتیوں کو یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ وہ کٹر قسم کے سیکولرسٹ ہیں اور مذہب کی بنیاد پر پیش کیے جانے والے کسی بھی استدلال کو تسلیم یا برداشت نہیں کرتے۔ اپنے آپ کو سیکولرسٹ ثابت کرنے کے شوق میں شیخ صاحب نے قلم درد کے گانے ”اسلام کی کشتی کو ہم پار لگا دیں گے“ تک پر پابندی لگا دی تھی۔

میں کچھ مدت کے لیے کالج ہوسٹل کے مسلم میس کا مینجر بنا اور میس مینجر کے کمرے میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کمرے میں مجھ سے پہلے رہنے والے کسی لڑکے نے کمرے کی الماری کے دروازے پر اندر کی طرف چاقو سے پاکستان زندہ باد کے الفاظ کندہ کئے تھے اور میں نے الفاظ پر چاک پھیر دیا چنانچہ الماری کا دروازہ کھلنے پر پاکستان زندہ باد کے الفاظ دور سے پڑھے جاتے تھے۔ ایک دن میں کمرے میں ہی تھا کہ کالج کی گھنٹی بجی اور میں الماری کا دروازہ کھلا چھوڑ کر اور کمرے کے دروازے کو بھی تالا لگائے بغیر کالج کی طرف بھاگا۔ ہوسٹل کالج سے متصل تھا اسی دوران شیخ صاحب جو وزیر تعلیم بھی تھے اچانک ہوسٹل کے معائنے کے لئے آ گئے۔ ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ پروفیسر محمود (جو پرنس محمود کے نام سے مشہور تھے) ان کے ساتھ تھے شیخ صاحب کمروں کی اندرونی حالت دیکھنا چاہتے تھے میرے کمرے کا دروازہ کھولا گیا اور سامنے الماری کے دروازے پر لکھے پاکستان زندہ باد کے الفاظ دکھائی دیئے تو شیخ صاحب آگ بگولہ ہو گئے فوراً مجھے کالج سے بلایا گیا۔ شیخ صاحب دوسرے کمروں کا معائنہ کرنے میں مصروف تھے۔ مجھے معاملے کے بارے میں پتہ چلا تو بہت گھبرایا۔ شیخ صاحب کا جلال ویسے ہی مشہور تھا۔ انہوں نے پوچھا کیا یہ عبارت تم نے لکھی ہے۔ میں نے سچ سچ بتا دیا تو انہوں نے مجھے خوب ڈانٹا۔ معلوم ہوتا تھا وہ

مجھے ابھی پولیس کے حوالے کریں گے۔ پھر میری طرف دیکھنے کے بعد پوچھنے لگے کیا تم استور کے رہنے والے وہی لڑکے نہیں ہو جو میرے پاس پاکستان جانے کے لئے پاس لینے آیا تھا۔ میں نے کہا جی میں وہی ہوں۔ اس پر خاصی نرمی سے کہنے لگے ”بچے فی الحال تعلیم پڑھو۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد سیاست کرنا۔ جاؤ یہ عبارت مٹا دو اپنا ہوم ورک کرو“ اور یہ کہہ کر وہ آگے چل دیئے۔

شیخ صاحب کا یہ طرز عمل میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ان دنوں کے حالات کے پیش نظر میرے اس جرم کے شیخ صاحب کے نوٹس میں آنے کے بعد مجھے کم از کم دو سال قید کی سزا ہونی چاہئے تھی لیکن شیخ صاحب نے مجھے سزا صرف اس نصیحت کی شکل میں دی۔ گو میں اپنے قیام سری نگر کے دوران ریاست کے پاکستان سے الحاق کا زبردست حامی تھا لیکن شیخ صاحب کی ذات کا بھی بڑا مداح تھا۔ شیخ صاحب سے میری عقیدت کا یہ حال تھا کہ 1953ء میں ایس ایم کالج کراچی میں کالج کے کچھ طلباء کی طرف سے شیخ صاحب کی ذات پر ریکر حملے برداشت نہ کر سکا اور نتیجے کی پرواہ کئے بغیر ان میں سے ایک کو تھپڑ رسید کیا اور اس کے نتیجے میں میری جو مرمت ہوئی اس کا مجھے افسوس نہیں ہوا۔

1964ء کے وسط میں شیخ صاحب پاکستان آئے تو میں اپنا ایم اے کا امتحان چھوڑ کر راولپنڈی پہنچ گیا۔ لیکن بڑی کوششوں کے باوجود ان سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔

شیخ صاحب کے پاکستان سے واپسی کے دو ماہ بعد آزاد کشمیر کے صدر کے ایچ خورشید صاحب کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ ان پر لگائے جانے والے الزامات میں سے ایک الزام یہ بھی تھا کہ شیخ صاحب کے مختصر دورہ مظفر آباد کے دوران خورشید صاحب نے ان سے کشمیری زبان میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں جو پاکستان کے مفاد کے خلاف تھیں۔ اپنی برطرفی کے کچھ مدت بعد خورشید صاحب کراچی آئے تو کراچی میں لبریشن لیگ کے سرگرم رکن خواجہ غلام حسن پنجابی کے ہاں جی ایم لون، میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان، خواجہ عطاء اللہ اور میں خورشید صاحب سے ملے۔ ان دنوں شیخ صاحب یورپ گئے ہوئے تھے ہماری گپ شپ کے دوران کسی نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ہم میں سے کوئی شخص یورپ جا کر شیخ صاحب سے ملے اور تحریک آزادی کے سلسلے میں ایک ٹھوس پروگرام پر ان سے تبادلہ خیال کرے۔ سب نے تجویز سے اتفاق کیا اور آخر فیصلہ ہوا کہ یورپ خورشید صاحب جائیں اور ان کے اس سفر کے اخراجات لون صاحب برداشت کریں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور خورشید صاحب چپکے سے فرانس پہنچ گئے اور شیخ صاحب سے ملاقات کی لیکن شیخ صاحب نے تجویز کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ خورشید صاحب سے سرد مہری سے پیش آئے چنانچہ خورشید صاحب وہاں سے شیخ صاحب کے بارے میں انتہائی مایوس کن تاثر لے کر واپس آ گئے۔

یورپ سے واپسی پر شیخ صاحب سعودی عرب گئے اور خاصی مدت تک وہاں ٹھہرے۔ ادھر جی ایم لون صاحب بھی حج کے لئے وہاں پہنچے اور بڑے پارڈ بیلنے کے بعد شیخ صاحب سے ملے اور ان سے گزارش کی کہ وہ پاکستان اور آزاد کشمیر میں اپنے عقیدت مندوں اور پیروکاروں کو مشورہ دیں کہ وہ تحریک آزادی میں کس طرح کوئی تعمیری کردار ادا کر سکتے ہیں۔ شیخ صاحب نے کوئی ٹھوس بات کرنے کے بجائے انہیں بری طرح ڈانٹ دیا چنانچہ لون صاحب انتہائی مایوس ہو کر وہاں سے نکلے اور یورپ چلے گئے۔ واپس آنے کے بعد ایک دن لون صاحب نے مجھے اکیلے میں کہا امان صاحب آپ چاہیں تو شیخ عبداللہ کو پوجتے رہیں میں تو ان سے انتہائی ناامید ہوا ہوں ہم لوگ شیخ صاحب کو جتنا عظیم اور محب وطن سمجھتے رہے ہیں۔ وہ اس کا عشرِ عشر بھی نہیں۔ انہوں نے اپنے استدلال کے حق میں ٹھوس ثبوت بھی دیئے۔

شیخ صاحب کے بارے میں خورشید صاحب اور لون صاحب کے تاثرات سننے کے بعد بھی ان سے میری عقیدت میں کوئی بڑا فرق نہیں آیا۔ غالباً 1968ء کے اوائل کی بات ہے میں پیر مقبول صاحب گیلانی کے ہاں بیٹھا تھا۔ ان دنوں شیخ صاحب جنوبی بھارت کے مقام کوڈائی کنال میں نظر بند تھے۔ میری اور گیلانی صاحب کی گپ شپ کا موضوع شیخ صاحب ہی تھے۔ باتوں باتوں میں گیلانی صاحب نے کہا کہ شیخ صاحب کو گلگتی چوغہ بہت پسند ہے ان کے پاس ایک چوغہ ہے لیکن اب بہت بوسیدہ ہو چکا ہے۔ شیخ صاحب سے میری عقیدت کا یہ حال تھا کہ میں دوسرے ہی دن ہوائی جہاز سے گلگت پہنچا اور مشہور کنٹریکٹر حبیب اللہ میر صاحب کو دو اعلیٰ قسم کے خوبصورت چوغوں کا آرڈر دیا۔ کچھ مدت کے بعد یہ دو چوغے گیلانی صاحب کی ہی وساطت سے شیخ صاحب کو بھیج دیئے گئے اس کے چند ماہ بعد میری گیلانی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ چوغے شیخ صاحب کو مل گئے ہیں اور انہوں نے میرے نام خط میں چوغے بھیجنے کے لئے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے بلکہ خط میں یہ مذاق بھی ہے (میں نے دونوں چوغے شیخ صاحب کے سات فٹ والے قد کے حساب سے بنوائے تھے اور شیخ صاحب سمجھتے تھے کہ ایک چوغہ بیک صاحب کے لئے ہے جو قد میں پانچ سوا پانچ فٹ تھے) کہ چوغے کو بیک صاحب پہن تو نہیں سکتے اس لئے کہ اس میں غائب ہو جاتے ہیں البتہ اسے خیمے کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ باتیں سن کر میرا تجسس بڑھ گیا اور میں نے گیلانی صاحب سے کہا کہ وہ خط مجھے دکھائیں۔ انہوں نے کہا آپ خط نہیں دیکھ سکتے اس لیے کہ اس میں بڑی راز کی باتیں ہیں۔ میرا تجسس اور بھی بڑھ گیا میں نے کہا مجھے وہی حصہ دکھائیں جس میں میرا ذکر ہے گیلانی صاحب نے مجھے خاصے پس و پیش کے بعد خط کا مجھ سے متعلق پیرا گراف دکھاتے ہوئے خط مجھے دے دیا اور پھر تاکید کی کہ میں خط کا اپنے سے متعلق حصہ ہی پڑھوں چنانچہ سارا خط پڑھنے کا میرا تجسس اور بھی بڑھ گیا۔ خط میرے ہاتھ میں آتے ہی میں باہر کی طرف بھاگا اور دوسرے کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

گیلانی صاحب دروازہ پٹے رہے اور میں نے اندر سارا خط پڑھ ڈالا۔ یہ طویل خط بیگ صاحب نے شیخ صاحب کی طرف سے گیلانی صاحب کو لکھا تھا اور اس میں ”کسی کے آگے نہ خم ہو سکی مری گردن۔ کسی جگہ میری آواز آج تک نہ دہی“ کے اشعار انتہائی ترنم سے پڑھ کر سامعین کے جذبات سے کھیلنے والے شیخ محمد عبداللہ نے اپنی خود داری کے پرچے اڑاتے ہوئے انتہائی عاجزانہ انداز میں گیلانی صاحب کے ذریعہ پاکستان کے ایک افسر سے استدعا کی تھی وہ حکومت پاکستان سے سفارش کر کے انہیں (شیخ صاحب کو) کچھ مزید مالی امداد دلا دیں۔ خط میں بار بار اپنی مجبوریوں کا رونا رویا گیا تھا۔ خط پڑھ کر لمحے بھر کے لیے تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جن لیڈروں کا ہم پرستش کی حد تک احترام کرتے تھے وہ اس طرح اپنی خود داری اور کشمیریت کا جنازہ بھی نکال سکتے ہیں۔

وقت گزرتا گیا اور میرے ذہن میں شیخ صاحب کے سابقہ امیج اور خط کے مندرجات کے مابین ایک جنگ جاری رہی یہاں تک کہ 1976ء میں میں برطانیہ چلا گیا۔ غالباً 1977ء میں مجھے شیخ صاحب اور مسز اندرا گاندھی کے مابین فروری 1975ء میں طے پانے والے دہلی ایکارڈ (Accord Delhi) کا اصل متن پڑھنے کا موقع ملا جس سے شیخ صاحب کے لئے میرے دل و دماغ پر پائی جانے والی باقی ماندہ عقیدت بھی دھڑام سے زمین بوس ہو گئی کیونکہ شیخ صاحب نے اس معاہدے کے پہلے ہی پیرا گراف میں پوری ریاست جموں کشمیر کو بھارت کا آئینی حصہ اور اٹوٹ انگ تسلیم کیا تھا اور اس معاہدے کے مندرجات پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس شخص کے خلاف قلم اٹھانا عین جہاد ہے اور میں نے یہ جہاد شروع کر دیا۔

میں نے 1978ء میں شیخ صاحب کو ایک طویل خط لکھا جس میں دہلی ایکارڈ کے کشمیر کش پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان سے پھر گزارش کی کہ وہ کشمیر کی آئندہ نسلوں کے مفاد میں اس معاہدے سے لا تعلق ہو جائیں اور ریاست کی مکمل خود مختاری کی تحریک چلائیں۔ کچھ مدت کے بعد مجھے ان کا ایک طویل خط ملا جس میں انہوں نے ریاست کی مکمل خود مختاری کے نظریے کو ناقابل عمل اور بھارت کے ساتھ الحاق کو کشمیر کے لئے بہترین راستہ قرار دیتے ہوئے کشمیریوں کے مصائب و آلام کی ساری ذمہ داری پاکستان پر ڈالی تھی۔

شیخ صاحب کے میرے نام اس خط کے دو ڈھائی سال بعد مرزا افضل بیگ کو شیخ صاحب نے وزارت سے علیحدہ کر دیا تو بیگ صاحب نے اعلانیہ طور پر شیخ صاحب پر الزام لگایا کہ وہ (شیخ صاحب) کشمیریوں کی تحریک آزادی کے نام پر پاکستان سے کروڑوں روپیہ وصول کر چکے ہیں۔ بیگ صاحب کا یہ بیان اخبارات میں پڑھ کر مجھے شیخ صاحب کے 1968ء میں گیلانی صاحب کے نام اور 1978ء میں میرے نام لکھے گئے خطوط کے مندرجات ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے دکھائی دیئے۔

شیخ صاحب کے بارے میں درج بالا حقائق و واقعات کا مجموعی تجزیہ کیا جائے تو ان کی شخصیت اور ان کے کردار کے تاریک پہلو کی ایک واضح شبیہ آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے لیکن یار رکھے یہ ان کے کردار کی تاریک پہلو ہی کی شبیہ ہے ان کی شخصیت کا روشن پہلو اس سے بالکل مختلف ہے۔

شیخ صاحب نے اپنی پچاس سالہ سیاسی زندگی میں مجموعی طور پر پندرہ سال سے زائد مدت کی جیل کاٹی اور بھارت کے فرقہ پرست ہندوؤں کے اور کشمیر کے اقتدار پرست ہم وطنوں کی طرف سے طرح طرح کے الزامات بھی برداشت کئے۔ ان کی ظاہری جرات اور بے باکی بھی مثالی تھی لیکن ان کی خدمات و خصوصیات پر ان کی درج بالا طرز کی کمزوریوں اور انتہائی نازک اور اہم موقعوں پر ان کی طرف سے سرزد ہونے والی فاش غلطیوں خاص کر 1975ء والی ملت فروشی نے پانی پھیر دیا اور ان غلطیوں کا خمیازہ اہل کشمیر کے علاوہ خود ان کا ذاتی امیج بھی بھگت رہا ہے اگر وہ یہ غلطیاں نہ کرتے تو ایک طرف خود انہیں آئندہ صدیوں کے دوران بڈشاہ ثانی کا درجہ دے کر عزت و احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا اور دوسری طرف کشمیری قوم بھی مصائب و آلام میں مبتلا ہونے کی بجائے کب کی آزاد اقوام عالم کی صف میں شامل ہو گئی ہوتی۔ اسی کو کہتے ہیں

لحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

1970ء میں لکھی گئی میری کتاب ”فری کشمیر“ میں شیخ صاحب کے بارے میں میرا وہ تبصرہ صحیح ثابت ہوا جس پر میرے اس وقت کے بہت سے ساتھی بیخ پا ہو گئے تھے۔ تحریک آزادی کشمیر سے متعلق شیخ صاحب کے کردار کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد میں نے (کتاب کے صفحہ 40 پر) لکھا تھا ”ان حقائق سے قطع نظر تاریخ نے برصغیر کی اس بڑی لیکن انتہائی متنازعہ شخصیت کے بارے میں ابھی اپنا حتمی فیصلہ نہیں دیا ہے۔ یہ حتمی فیصلہ شاید مسئلہ کشمیر کی آخری شکل اور شیخ صاحب کی بقیہ زندگی کے دوران ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی روشنی میں دیا جائے گا۔“



چوتھا باب

تحریک آزادی میں کشمیری صحافیوں اور دوسرے قلمکاروں کا کردار

تحریک آزادی کشمیر کو زندہ رکھنے کے لئے جہاں دوسرے حلقوں اور عوامل نے اہم کردار ادا کیا ہے وہاں حد متارکہ جنگ کے اس طرف کے صحافیوں ادیبوں اور شاعروں نے بھی مجموعی طور پر خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔

حد متارکہ جنگ کے اس طرف کی کشمیری صحافت کو تین حلقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حلقہ تو ان صحافیوں پر مشتمل ہے جو اپنے ہفت روزے یا پندرہ روزے شائع کرتے ہیں۔ دوسرا حلقہ وہ لوگ ہیں جو آزاد کشمیر میں پاکستان کے قومی اخبارات اور رسائل کے نمائندوں کے فرائض انجام دیتے ہیں اور تیسرا حلقہ ان احباب پر مشتمل ہے جو پاکستان میں یا بیرون پاکستان ذرائع ابلاغ سے متعلق اداروں سے منسلک ہیں۔

اپنے ہفت روزے شائع کرنے والے کشمیری صحافیوں کی بھاری اکثریت مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے مہاجرین پر مشتمل ہے اور یہ لوگ زیادہ تر سیالکوٹ، راولپنڈی اور مظفر آباد میں آباد ہیں۔ ان لوگوں نے جبری ہجرت اور غریب الوطنی سے منسلک جانکاہ مسائل کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے طرز پر اور مختلف نظریات کے تحت مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کو زندہ رکھنے کے لئے اہم کردار ادا کیا ہے گو کچھ احباب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیٹ سے سوچنے کے شغل میں بھی مصروف ہو گئے۔ کچھ آزاد خیال اور آزادی پسند صحافیوں نے اپنی آزاد خیالی کی بڑی قیمتیں بھی ادا کیں۔ چنانچہ خود مختار کشمیر کے نظریہ کے حامل خواجہ غلام نبی گلکار مرحوم اور میر عبدالعزیز نے ”غیر پسندیدہ نظریات کی پرچار“ کرنے کی پاداش میں ایک ایک سال کی جیل کاٹی۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ (حال چیف ایڈیٹر روزنامہ آفتاب سری نگر) کو غالباً 1956ء میں سردار عبدالقیوم نے آزاد کشمیر سے جبرا مقبوضہ کشمیر کی طرف دھکیل دیا۔ قائد کے مدیر جی ایم مفتی کو اپنے نظریات کی سزا مدت تک غربت و افلاس کی شکل میں بھگتنی پڑی۔ ولر کے مجید امجد بٹ کا

ڈیکلیریشن مدت تک بند رہا، فری کشمیر کے میر عبدالرشید کے لئے اور ماہنامہ وائس آف کشمیر کے مدیر کی حیثیت سے میرے لئے ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ ہمیں اپنے جریڈوں کی اشاعت ہی بند کرنی پڑی۔ بہت سے دوسرے صحافی بھی ایسے ہی حالات سے دو چار ہوتے رہے۔ جن میں روزنامہ آزاد کشمیر کے میر عبدالمنان بھی شامل ہیں۔

گو 1947ء کے بعد جاری ہونے والے بہت سے ہفت روزے اب بند ہو چکے ہیں اس کے باوجود اس وقت آزاد کشمیر کی طرف سے جاری کردہ اجازت ناموں کے تحت شائع ہونے والے ہفت روزوں کی تعداد چالیس کے قریب ہے۔ البتہ ان میں سے نصف درجن بھر ہی باقاعدگی اور مناسب ضخامت کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ہفت روزے خاص کر انصاف، کشمیر، قائد اور خاصی حد تک پاک کشمیر، مقبوضہ کشمیر کی خبروں کو خاصی کوریج دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے قارئین اپنے مادر وطن کے بھارتی مقبوضہ حصے کے حالات و واقعات سے خاصی حد تک باخبر رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں تحریک آزادی کے لیے ان احباب کی یہی ایک خدمت قابل ستائش ہے۔ مہاجر صحافیوں کی اکثریت نے اپنا بچپن مقبوضہ کشمیر میں گزارا ہے ان کے بزرگوں کی آخری آرام گاہیں بھی وہیں ہیں اور وہاں کے حالات سے بھی پوری طرح واقف ہیں اسلئے جو دلچسپی مقبوضہ کشمیر اور اس کی آزادی سے انہیں ہے ان کی اولاد کو (جس کی بھاری اکثریت نے مقبوضہ کشمیر دیکھا تک نہیں) نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ خدشہ ہے کہ وقت گزرنے اور کشمیری صحافیوں کی موجودہ بوڑھی نسل کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے سلسلے میں کشمیری صحافیوں کی کارکردگی بھی بُری طرح متاثر ہوتی جائے گی۔

آزاد کشمیر میں پاکستان کے قومی اخبارات اور رسائل کے نمائندوں کے فرائض انجام دینے والے احباب کی بھیجی ہوئی خبریں اور ڈسمچر زیادہ تر آزاد کشمیر کی سیاست سے متعلق امور کے بارے میں ہوتے ہیں۔ یہ احباب پاکستان کے کثیر الاشاعت اخبارات کے ذریعہ تحریک آزادی کی بڑی خدمت کر سکتے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کا یہ طرز عمل ان اخبارات کی طرف سے ملنے والی ہدایات کا نتیجہ ہو اس کے باوجود یہ احباب اہل پاکستان کو تحریک آزادی سے پوری طرح باخبر رکھنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

پاکستان کے کثیر الاشاعت اخبارات اور رسائل کے ذریعہ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اہل پاکستان کو باخبر رکھنے کے سلسلے میں لاہور کے کلیم اختر صاحب اور راولپنڈی کے میر عبدالعزیز صاحب خاصا اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ کلیم اختر جن کا تعلق جموں سے ہے پاکستان کے کثیر الاشاعت اردو اخباروں میں مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں پر معلوماتی مضامین باقاعدگی سے لکھتے ہیں جبکہ میر عبدالعزیز پاکستان کے اہم ترین اخباروں اور رسائل کے کالموں کے ذریعے اہل پاکستان اور پاکستان میں دنیا بھر کے سفارت

کاروں کو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ رکھتے ہیں۔ میر صاحب ایک رپورٹ کی حیثیت سے بھی اہم شخصیات کی پریس کانفرنسوں کے دوران ان سے مسئلہ کشمیر کے کسی نہ کسی پہلو پر سوال پوچھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں ایک بار انہوں نے پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق سے کشمیر کی خود مختاری کی بالواسطہ حمایت بھی کروائی۔ صف اول کی بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی رائٹرز سے منسلک راجہ محمد اصغر اپنی پیشہ وارانہ مجبوریوں کے باوجود مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور پاکستان پریس انٹرنیشنل کے الطاف حمید راؤ بھی تحریک آزادی کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں اپنے قومی فرائض بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ چمن کوٹ (ضلع باغ آزاد کشمیر) کے نوجوان صحافی سید منزل حسین جعفری نے سعودی عرب میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں عرب اخبارات اور رسائل میں شائع کرائے گئے اپنے مضامین کے ذریعے مسئلہ کشمیر کے بارے میں عرب دنیا کا حافظہ تازہ کرنے اور تحریک آزادی کشمیر کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی طرح سید بشیر حسین جعفری بھی خاصی مدت تک پاکستانی اخبارات میں لکھتے رہے۔ دوسرے کچھ صحافی پروفیسر محمد اسحاق سرشار اختر ملک وغیرہ بھی مسئلہ کشمیر پر لکھتے رہتے ہیں۔ برطانیہ میں مقیم کشمیری صحافی پروفیسر محمود ہاشمی، علی کیانی، مولانا محمود احمد میرپوری مرحوم، اسلم لون اور عبدالرحمن بگلش بھی اپنے قومی فرائض انجام دیتے رہے۔

تحریک آزادی کے بارے میں حد متارکہ جنگ کے اس طرف کے کشمیریوں کی 1947ء کے بعد کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد انتہائی قلیل ہے۔ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ڈاکٹر صوفی کی کتاب، کثیر، تحریک آزادی سے کہیں زیادہ تاریخ کشمیر سے تعلق رکھتی ہے۔ پروفیسر محمود ہاشمی کی کتاب کشمیر اداس ہے، تحریک آزادی کے ایک ہی پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ سردار محمد ابراہیم خان کی کتاب ”کشمیر ساگا“ میں تحریک آزادی کے کچھ اہم پہلو شامل ہیں چوہدری غلام عباس مرحوم کی خودنوشت سوانح عمری کشمکش اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود تاریخی طور پر اہم ہے۔ جیش محمد یوسف صراف کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب ”کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کی تاریخ“ ایک ریفرنس بک کی حیثیت سے خاصی اہم ہے لیکن صراف صاحب نے تحریک آزادی کے کچھ اہم پہلوؤں کو مناسب اہمیت نہیں دی ہے اور کچھ کے بارے میں خاصی جانبداری برتری ہے۔ سردار عبدالقیوم خان کی دو کتابیں، کشمیر بنے گا پاکستان، اور مقدمہ کشمیر، ان کی مخصوص سیاسی سوچ کی عکاسی کرتی ہیں۔ سردار صاحب اپنے نظریے کو اجاگر کرنے کی کوشش میں کبھی کبھی قابل افسوس حد تک آگے نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ نظریہ خود مختار کشمیر کی مخالفت میں وہ اس حد تک گئے ہیں کہ کشمیریوں کے لئے ریاست کی مکمل خود مختاری کی نسبت بھارتی ہندوؤں کی غلامی کو بہتر قرار دیتے ہیں۔ راجہ محمد عارف کی کتاب ”کشمیر تاریخ کے آئینے میں“ (پبلا ایڈیشن) تحریک آزادی کی

حالیہ تاریخ کے طالب علموں اور آزادی پسندوں کے لئے ایک قیمتی تحفہ ہے۔ راولا کوٹ کے غازی محمد امیر خان کی کتاب کا بیشتر حصہ بقول ہفت روزہ انصاف 1947-48ء کی جنگ آزادی کے دوران اہل پونچھ کی کارکردگی کا ہی احاطہ کرتا ہے۔ سابق طالب علم رہنما عباس احمد آزاد کی دو کتابیں ”آزاد کشمیر کیا سوچتا ہے اور“ ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تقدیر کا“ (مزید دو کتابیں زیر طبع ہیں) مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ آزاد صاحب بھی اپنی مخصوص طرز فکر کے زیر اثر آکر کبھی کبھی بہت دور نکل جاتے ہیں اور ان کی کتابوں میں بھی ان کے اس طرز عمل کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

میری اپنی کتاب فری کشمیر تحریک آزادی سے کہیں زیادہ نظریہ خود مختار کشمیر کے حق میں دیئے گئے دلائل پر مبنی ہے۔ تحریک آزادی سے بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر متعلق کچھ اور کتابیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن چونکہ میں نے وہ کتابیں نہیں پڑھی ہیں اس لئے ان پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔

بھارتی مقبوضہ کشمیر میں گذشتہ ایک عشرے میں لکھی گئی کتابوں میں سے سب سے اہم غالباً شیخ محمد عبداللہ کی سوانح حیات ”آتش چنار“ خواجہ ثناء اللہ بٹ کی کتاب اور فاروق رحمانی کی کتاب ”آزادی کی تلاش“ ہیں۔ شیخ صاحب کی آتش چنار، خود ان کی ذات کے گرد ہی گھومتی ہے اور اس کے اکثر مندرجات ان کے استقبالات کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔ شیخ صاحب کی شخصیت سے تحریک آزادی سے متعلق جس قسم کی تفصیلات کی توقع کی جاسکتی تھی کتاب میں کہیں ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ میں نے یہ کتاب برطانیہ کے برکسٹن جیل میں دو دفعہ پڑھی اور اسے پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ ثناء اللہ بٹ صاحب کی کتاب کے کچھ اقتباسات ہی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے انہوں نے جس ماحول میں یہ کتاب لکھی ہے اس کے پیش نظر اس سے بہتر کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ فاروق رحمانی کی ”آزادی کی تلاش“ پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ کتاب ان کے زورِ قلم اور جرات کی عکاسی کرتی ہے لیکن انہوں نے لفظ آزادی کی کوئی واضح تشریح نہیں کی ہے۔

شیخ محمد عبداللہ کے بارے میں لکھتے ہوئے رحمانی صاحب بھی اپنی مخصوص فکر کے زیر اثر ایک سمت میں ضرورت سے زیادہ آگے نکل گئے ہیں۔ کچھ اور کتابوں خاص کر شبّثم قیوم صاحب کی کتاب ”یہ کس کا لہو ہے کون مرا“ اور رشید تاثیر کی ”تاریخ حریت کشمیر“ کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن خاصی کوشش کے باوجود یہ کتابیں حاصل نہ کر سکا۔

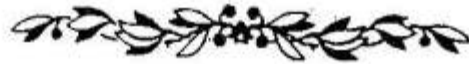
مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر پر بھارتی، پاکستانی، یورپین اور امریکی قلم کاروں کی لکھی ہوئی کتابوں کے علاوہ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کی طرف سے بھی خاص مواد شائع ہوا ہے۔ بہر حال کشمیریوں کی محکومی، کمپرسی اور بے چارگی کی صحیح تصویر پاکستان کے معروف اور

کشمیری نثر ادیب سعادت حسن منٹو مرحوم کی شہرہ آفاق تحریر ”ٹیڈال کا کتا“ سے ہی ابھرتی ہے۔

مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر اب تک مختلف کشمیری سیاسی اور طلباء تنظیموں اور افراد کی طرف سے سینکڑوں کتابچے شائع کئے گئے ہیں جن میں خود میرے لکھے گئے درجن بھر کتابچے بھی شامل ہیں۔ بھارتی ہوائی جہاز گنگا کی ہائی جیکنگ کے کیس کے ملزموں مقبول بٹ شہید، اشرف قریشی، جی ایم لون اور میر عبدالقیوم کے علاوہ عبدالخالق انصاری اور غلام مصطفیٰ صاحب علوی کے عدالتی بیان پر مشتمل کتابچے بھی تحریک آزادی اور مسئلہ کشمیر کے اہم پہلوؤں پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔

گو کشمیری شاعروں نے تحریک آزادی کے سلسلے میں وہ کردار ادا نہیں کیا جو محکوم قوموں کے محب وطن شاعروں کا خاصہ ہوتا ہے بایں ہمہ کچھ شاعروں نے (حد متار کہ جنگ کے اس طرف) اپنا قومی فرض خاصی حد تک ادا کیا ہے اور اگر ان گنے چنے شاعروں میں میر پور کے پروفیسر نذیر انجم اور برہنگم کے محمد عارف کو سرفہرست قرار دیا جائے تو شاید غلط نہ ہو گا۔

الغرض کشمیری صحافیوں اور دوسرے قلمکاروں نے تحریک آزادی کے سلسلے میں مجموعی طور پر خاصا کردار ادا کیا ہے لیکن تحریک آزادی ان سے کہیں زیادہ اور بہتر کارکردگی کا تقاضا کرتی ہے۔



پانچواں باب

ریاست جموں و کشمیر سے متعلق اہم تاریخی جغرافیائی حقائق

اہم تاریخی جغرافیائی اور دیگر حقائق

ذیل میں کشمیر کی تاریخ اور جغرافیہ اور مسئلہ کشمیر و تحریک آزادی سے متعلق ایسے حقائق پیش خدمت ہیں جن کا جاننا ہر اس کشمیری کے لیے ضروری ہے۔ جو اپنی قومی تاریخ اور تحریک آزادی میں دلچسپی رکھتا ہو۔

تاریخی حقائق

- 1- چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر کے سیاسی افق پر مسلمانوں کے نمودار ہونے سے پہلے اس پر اکیس (21) خاندانوں نے حکومت کی تھی۔ جن میں سے اٹھارہ مقامی تھے اور ان کے عہد ہائے حکومت میں کشمیر ایک آزاد و خود مختار ملک تھا۔
- 2- کشمیر کے معروف مورخ محمد دین فوق کے مطابق کشمیر میں ہندو دور حکومت کے اہم ترین حکمران راجہ لتا دیتا (715ء تا 752ء) نے بنگال اور جنوبی ہند سے لیکر سری لنکا کو بھی فتح کیا لیکن کہیں بھی اپنی مستقل حکومت قائم نہیں کی۔
- 3- مسلمانوں نے کشمیر پر 480 سال (1339ء سے 1819ء تک) حکومت کی جن میں سے 246 سال کے دوران کشمیر ایک آزاد و خود مختار ملک تھا۔
- 4- اپنے عظیم مقامی حکمران سلطان زین العابدین بڈشاہ (1420ء تا 1470ء) کے دور حکومت میں کشمیر برصغیر کا خوشحال ترین، پرامن ترین اور دفاعی لحاظ سے مضبوط ترین ملک تھا۔ چنانچہ بڈشاہ کے دور حکومت کو تاریخ کشمیر کا سنہری باب کہا جاتا ہے۔ اس دور میں چینی ترکستان کا علاقہ سکیانگ - افغانستان - پنجاب اور تبت سلطنت کشمیر میں شامل تھے۔
- 5- خود مختار کشمیر کے آخری حکمران (چک) خاندان کا آبائی علاقہ دروستان (گلگت بلتستان) تھا۔

- 6- ہندوستان کے اکبر بادشاہ نے کشمیر کے سنی علماء کی درخواست پر کشمیر پر حملہ کیا۔
- 7- کشمیریوں نے اکبر بادشاہ کی فوجوں کو دوبار شکست دی لیکن تیسرے حملے میں وہ کشمیر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔
- 8- کشمیر کی خود مختاری کا خاتمہ 1586ء میں ہوا جب اکبر بادشاہ نے اسے اپنی مغل سلطنت میں ضم کیا۔ جس کے بعد سے کشمیر اب تک غلام چلا آ رہا ہے۔
- 9- پونچھ پر قبضہ کرنے کے لئے جموں کے ڈوگرہ گلاب سنگھ نے 1832ء میں وہاں کے عوام کا قتل عام کرایا۔ ان کے لیڈروں سردار سبز علی خان اور ملی خان کی زندہ کھالیں اتروائیں۔ سردار شمس خان کا سر قلم کرایا اور ہزاروں خواتین اور بچوں کو اغوا کر کے جموں پہنچایا۔
- 10- بلتستان اور استور پر ڈوگروں نے 1840ء میں پر قبضہ کیا۔
- 11- علاقہ یاسین کے حکمران گوہر امان نے 1840ء میں گلگت پر قبضہ کیا۔ گلگت کے راجہ کریم خان بھاگ کر سرینگر پہنچے اور کشمیر میں سکھوں کے گورنر سے گلگت پر حملہ کرایا۔ چنانچہ 1842ء میں گلگت پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا لیکن گوہر امان نے حملہ کر کے 1844ء میں گلگت پر دوبارہ قبضہ کیا۔ ڈوگروں نے (جو اب معاہدہ امرتسر کی رو سے کشمیر کے حکمران بن گئے تھے) 1846ء میں گلگت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کیا لیکن گوہر امان نے ایک بار پھر گلگت پر حملہ کر کے ڈوگروں کو وہاں سے مار بھگایا۔ اس جنگ میں راجہ کریم خان اور ڈوگرہ فوج کے سربراہ کرنل نتھے شاہ دونوں مارے گئے۔ لیکن گوہر امان کی وفات کے بعد ڈوگروں نے گلگت (خاص) پر مستطاً قبضہ کر لیا۔ موجودہ علاقہ گلگت اس زمانے میں بہت سے راجاؤں میں بٹا ہوا تھا۔ جن میں سے گلگت خاص ہنزہ - نگر اور یاسین کے راجے اہم ترین تھے۔ گلگت (خاص) اور نگر کے حکمران شیعہ تھے۔ یاسین کے سنی اور ہنزہ کے اسماعیلی چنانچہ ان کے مابین ہمیشہ فرقہ وارانہ منافرت رہتی تھی۔ اور اسی منافرت نے غالباً "گوہر امان سے گلگت پر حملہ کرایا اور گلگت کے راجہ کریم خان اور اس کے بیٹے کو گوہر امان کے خلاف سکھوں اور ڈوگروں کی مدد حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ جس کے نتیجے میں سارے علاقے پر بالآخر ڈوگروں کا قبضہ ہو گیا۔ بد قسمتی سے یہ منافرت آج بھی موجود ہے۔
- 12- ڈوگروں نے گلگت پر پہلا حملہ 1846ء میں کیا تھا لیکن انہیں پورے علاقے پر قبضہ کرنے میں 45 سال لگے اور 1891ء میں سارے علاقے پر قابض ہو گئے۔
- 13- خاصی مدت تک ریاست چترال بھی ریاست جموں کشمیر کی با بگذا رہی ہے۔
- 14- معاہدہ امرتسر کے تحت موجودہ ضلع ہزارہ اور ضلع کوہستان کے بہت سے علاقے بھی ریاست جموں کشمیر میں شامل ہو گئے تھے جنہیں ڈوگروں نے جموں سے مشرق میں واقع کچھ علاقوں کے عوض انگریزوں کے حوالہ کر دیا۔

15- 1930ء کے عشرے کے اوائل میں قائم ہونے والے کلینسی کمیشن نے کشمیر کے لیے کچھ آئینی - سیاسی - قانونی - اقتصادی اور سماجی اصلاحات کی سفارش کی تھی۔ جس کے (اور عوامی دباؤ کے) نتیجے میں 1934ء میں کشمیر اسمبلی (پر جاسبھا) قائم ہوئی جو کچھ منتخب اور کچھ (مہاراجہ کی طرف سے) نامزد ممبروں پر مشتمل ہوتی تھی اور اس کے انتخابات ہر چار سال کے بعد ہوتے تھے۔

16- 13 جولائی 1931ء کو سرینگر میں ڈوگرہ فوج کی فائرنگ سے 22 کشمیری مسلمان شہید اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔

17- ریاست جموں کشمیر کی پہلی سیاسی پارٹی (آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس) 1932ء میں قائم ہوئی۔ 1939ء میں اسے نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا گیا۔ 1942ء میں چوہدری غلام عباس خان اور ان کے کچھ ساتھیوں نے مسلم کانفرنس کا احیاء کیا۔

18- 29 مارچ 1935ء کو برصغیر کے انگریز حکمرانوں نے گلگت کے دریائے سندھ کے مغرب میں واقع علاقے اور چلاس مہاراجہ کشمیر سے ساٹھ سال کے پٹے پر لئے جو یکم اگست 1947ء کو ریاست کو واپس کر دیئے گئے۔ بارہ سال کے اس عرصے کے دوران بھی پورا علاقہ بلتستان اور استور ریاستی حکومت کے تحت رہے۔ یکم اگست 1947ء کو ریاستی حکومت نے لداخ بلتستان - استور اور گلگت کو ملا کر ریاست کا تیسرا صوبہ قائم کیا۔ گلگت کے انگریزوں کے تحت رہنے کے بارہ سال کے دوران بھی گلگت میں ریاستی پرچم لہرانے کے علاوہ یہاں کی معدنیات وغیرہ سے متعلق حقوق بھی ریاستی حکومت کو ہی حاصل تھے۔

19- 1947ء تک استور اور بلتستان کو کشمیر اسمبلی میں نمائندگی حاصل تھی۔ استور سے کشمیر اسمبلی کے آخری ممبر کا چو سلطان محمد شاہ اور بلتستان سے خیلو کے راجہ تھے۔

20- گذشتہ چھ سو پچاس سال (1340ء میں کشمیر میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے آج تک) کے دوران کشمیر 246 سال (1340ء سے 1586ء تک) آزاد و خود مختار رہا، 166 سال (1586ء سے 1752ء تک) مغلوں کے تحت، 67 سال (1752ء سے 1819ء تک) افغانوں کے تحت، 27 سال (1819ء سے 1846ء تک) سکھوں کے تحت، ایک ہفتہ (9 مارچ 1846ء سے 16 مارچ 1846ء) براہ راست انگریزوں کے تحت جبکہ 101 سال (1846ء سے 1947ء تک) ڈوگروں کے تحت رہا اور گذشتہ چالیس سال سے اس کا بڑا حصہ بھارت کے جبری قبضے میں ہے۔ دوسرے حصے میں نیم خود مختار آزاد کشمیر حکومت قائم ہے اور تیسرا حصہ (گلگت بلتستان) براہ راست حکومت پاکستان کے کنٹرول میں ہے۔

جغرافیائی حقائق

- 1- ریاست جموں کشمیر کی موجودہ آبادی ایک کروڑ دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ جن میں سے ستر (70) لاکھ کے قریب بھارتی مقبوضہ کشمیر میں، پچیس (25) لاکھ کے قریب آزاد کشمیر میں، نو (9) لاکھ کے قریب گلگت بلتستان میں اور تقریباً دس (10) لاکھ پاکستان اور دیگر ممالک میں رہتے ہیں۔
- 2- ریاست جموں کشمیر کی کل آبادی کا 77 فیصد مسلمان، 20 فیصد ہندو اور 3 فیصد سکھ۔ بودھ اور عیسائی ہیں۔ آزاد کشمیر گلگت بلتستان کی آبادی سو فیصد مسلمان ہے۔ جبکہ مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً 65 فیصد ہے۔
- 3- ریاست جموں کشمیر کی یہ آبادی دنیا کے ایک سو اٹھ (160) آزاد خود مختار ممالک میں سے ایک سو تین (103) ممالک کی انفرادی آبادی - 31 ممالک کی مجموعی آبادی اور پچیس (25) سے زیادہ آزاد مسلم ممالک کی انفرادی آبادی سے زیادہ ہے۔
- 4- ریاست جموں کشمیر کا کل رقبہ تقریباً ایک لاکھ نوے ہزار مربع کلومیٹر (تقریباً 85 ہزار مربع میل) جس میں سے تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار مربع کلومیٹر بھارت کے تسلط میں (اس میں تقریباً تیس ہزار مربع کلومیٹر وہ علاقہ یعنی اقصائے چن وغیرہ بھی شامل ہیں جو 1960ء سے چین کے زیر تسلط ہے) تقریباً دس ہزار مربع کلومیٹر آزاد کشمیر اور تقریباً ساٹھ ہزار مربع کلومیٹر گلگت بلتستان ہیں۔
- 5- ریاست جموں کشمیر رقبے میں دنیا کے 72 ممالک سے بڑی ہے۔ یورپ کے پانچ ممالک (ہالینڈ، نیلیم، ڈنمارک، البانیہ اور آسٹریا) کا مجموعی رقبہ جموں کشمیر کے رقبے سے کم ہے۔
- 6- ریاست جموں کشمیر فی کس آمدنی اور خواندگی کے لحاظ سے دنیا کے تقریباً اسی (80) ممالک سے آگے ہے۔
- 7- ریاست جموں کشمیر کی معیشت کے بنیادی ستون سیاحت، زراعت، بیرون ملک برسر روزگار ریاستی باشندوں کا کمایا ہوا زر مبادلہ، جنگلات، پھل فروٹ، دستکاری، قالین سازی اور معدنیات ہیں۔
- 8- وادی کشمیر کو اس کی قدرتی خوبصورتی اور صحت بخش آب و ہوا کی وجہ سے ایشیا کا سوکڑا لینڈ کہا جاتا ہے۔
- 9- ریاست جموں کشمیر میں سات مقامی زبانیں (کشمیری، ڈوگری، پہاڑی، گوجری، بلتی، شینا اور بروشکی) بولی جاتی ہیں۔
- 10- دنیا کی چار بلند ترین چوٹیوں میں سے دو (کے ٹو اور نانگا پربت) ریاست جموں کشمیر کے علاقوں بلتستان اور گلگت (دیامر) میں واقع ہیں۔ برصغیر کے سرد ترین علاقے (سیاچین وغیرہ) اور

خاصے گرم علاقے (جموں میرپور وغیرہ) بھی ریاست جموں کشمیر میں ہیں۔
 II- ریاست جموں کشمیر کے مغرب اور جنوب مغرب میں پاکستان، جنوب میں بھارت، مشرق اور شمال میں عوامی جمہوریہ چین اور شمال مغرب میں افغانستان واقع ہیں۔ ریاست کی شمالی سرحد کو روس کی جنوبی سرحد سے چین کے علاقہ سکیانگ اور افغانستان کے علاقہ واخان کی تقریباً بیس کلومیٹر چوڑی پٹیاں جدا کرتی ہیں۔ ریاست جموں کشمیر کے ساتھ سب سے لمبی سرحد چین کی دوسرے نمبر پر پاکستان کی اور تیسرے نمبر پر بھارت کی ہے۔

کشمیر سے متعلق

معاهدے، اعلانات، مذاکرات اور واقعات

گذشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران کشمیر سے متعلق بہت سے معاهدے۔ اہم اعلانات اور مختلف فریقین کے مابین مذاکرات ہوئے ہیں۔ جن میں سے اکثر نے مسئلہ کشمیر پر گہرا اثر ڈالا۔ ان میں سے کچھ سے متعلق اہم حقائق ذیل میں مختصراً درج ہیں:

معاہدہ لاہور۔ یہ معاہدہ 9 مارچ 1846ء کو شمالی ہندوستان کے سکھ حکمرانوں (جنہیں انگریزوں نے جنگ میں شکست دی تھی) اور فاتح انگریزوں کے درمیان ہوا اور اس معاہدے کے تحت کشمیر سکھوں کی عملداری سے نکل کر انگریزوں کی تحویل میں چلا گیا۔

معاہدہ امرتسر۔ معاہدہ لاہور کے ایک ہفتہ بعد یعنی 16 مارچ 1846ء کو انگریزوں اور جموں کے ڈوگرہ حکمران راجہ گلاب سنگھ کے درمیان ہوا۔ (ڈوگرے سکھ نہیں ہندو ہوتے ہیں) جس کے تحت انگریزوں نے وادی کشمیر اور اس کے شمال اور مشرق میں واقع کچھ علاقے 75 لاکھ روپے (تاک شاہی) کے عوض گلاب سنگھ کو فروخت کئے۔

اعلان آزادی ہند۔

3 جون 1947ء کو برصغیر کی آزادی کے پروگرام کا اعلان ہوا۔ جس کے مطابق 14 اگست 1947ء کو برطانوی ہند (برصغیر کے وہ علاقے جہاں انگریز براہ راست حکمران تھے) کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک نئی مملکت پاکستان قائم ہونی تھی اور 15 اگست 1947ء کو برطانوی ہند کے باقی علاقے آزاد ہندوستان (بھارت) کھلانے تھے۔ ریاست جموں کشمیر سمیت برصغیر کی پانچ سو سے

زیادہ نیم خود مختار محض ریاستوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنا تھا۔ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا یہ حق (مسلم لیگ کے مطالبے پر) عوام کی بجائے ریاستوں کے محض حکمرانوں کو دیا گیا تھا۔ البتہ ان پر زور دیا گیا تھا کہ وہ یہ فیصلہ کرتے وقت ریاست کے عوام کے مذہبی لحاظ سے تناسب، ریاست کے جغرافیائی محل وقوع اور ریاست کے اقتصادی تقاضوں کو مد نظر رکھیں۔

قائد اعظم کا اعلان۔ 17 جون 1947ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح نے ایک اہم پالیسی بیان اخبارات کو جاری کیا (جو 18 جون کے اخبارات میں شائع ہوا) جس میں کہا گیا کہ مسلم لیگ کی نظر میں برصغیر کی محض ریاستوں کو حق حاصل ہے کہ وہ بھارت اور پاکستان میں سے کسی ایک سے الحاق کریں یا مکمل خود مختاری کا اعلان کریں۔ انہوں نے 11 جولائی 1947ء کو اپنے اس اعلان کو دہراتے ہوئے ریاست جموں کشمیر کی حکومت سے کہا کہ اگر وہ ریاست کی مکمل خود مختاری کا اعلان کرے تو پاکستان کو اس کے ساتھ باہمی مفادات سے متعلق معاہدہ کرنے میں خوشی ہوگی۔

پونچھ میں بغاوت۔ قیام پاکستان کے ڈیڑھ دو ہفتے بعد پونچھ کے جنگجو لوگوں نے وہاں متعین ڈوگرہ افواج کے مظالم کے رد عمل کے طور پر ڈوگرہ حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

جمہوریہ آزاد کشمیر کا قیام۔ 4 اکتوبر 1947ء کو مسٹر انور (غلام نبی گلکار) کی سربراہی میں ریاست جموں کشمیر کے لئے ایک عارضی خود مختار حکومت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

قبائل کشمیر میں داخل ہو گئے۔ 22 اکتوبر 1947ء کو پاکستان کے قبائلی علاقوں، ریاست سوات اور ضلع ہزارہ کے ہزاروں قبائل مظفر آباد کے راستے وادی کشمیر کی طرف روانہ ہوئے۔

آزاد حکومت کی تنظیم نو۔ 24 اکتوبر 1947ء کو ریاست کی آزاد حکومت کی تنظیم نو کی گئی اور پونچھ کے سردار محمد ابرہیم خان (ممبر کشمیر اسمبلی) اس کے صدر بنے۔

بھارت سے نام نہاد الحاق۔ 26 اکتوبر 1947ء کو مہاراجہ ہری سنگھ (جو سری نگر سے بھاگ کر جموں پہنچا تھا) نے ریاست کے بھارت سے نام نہاد الحاق کی دستاویز پر دستخط کئے

اور 27 اکتوبر کو بھارتی فوجیں سری نگر کے ہوائی اڈے پر اتریں۔

گلگت کے گورنر کی گرفتاری۔ 31 اکتوبر اور یکم نومبر 1947ء کی رات کو گلگت سکاؤٹس نے (بونچی میں مقیم ریاستی فوج کے مسلمان افسروں کے مشورے اور مدد سے) گلگت کے ڈوگرہ گورنر بریگیڈیئر گھنسا راسکھ کی رہائش گاہ کا محاصرہ کیا اور یکم نومبر کی صبح کو اسے گرفتار کیا۔

گلگت میں عارضی حکومت کا قیام۔ ریاستی فوج کے مسلمان افسروں گلگت سکاؤٹس کے جونیئر کمیشنڈ افسروں اور گلگت کے مقامی زعماء کے باہمی مشورے کے نتیجے میں 2 نومبر 1947ء کو مقامی سطح پر ایک عارضی حکومت قائم کی گئی۔ گلگت خاص کے راجہ شاہ رئیس خان کو اس حکومت کا سربراہ اور کشمیر انفنٹری کے کمپنن مرزا حسن خان کو اس حکومت کی فوج کا سربراہ بنایا گیا۔ دو ہفتے بعد پاکستان نے ان علاقوں کے لئے سردار محمد عالم خان کو پولیٹیکل ایجنٹ نامزد کر کے وہاں بھیجا۔ جس نے وہاں کا نظم و نسق سنبھالا اور آزاد حکومت کو بغیر کسی اعلان کے ختم کر دیا گیا۔

مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں۔ یکم جنوری 1948ء کو بھارت مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں لے گیا۔

عنوان میں تبدیلی۔ یکم جنوری 1948ء سے 20 جنوری 1948ء تک اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر ہونے والی بحث کا عنوان ”ریاست جموں کشمیر کی صورت حال پر بحث“ (Discussion on Situation in Jammu and Kashmir) تھا۔ 20 جنوری کو پاکستان کے وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان نے سلامتی کونسل کے صدر کو خط لکھا۔ (سلامتی کونسل نے اس خط کو اپنا نمبر S/655 دیا) جس میں بحث کے اس عنوان کو تبدیل کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ چنانچہ 20 جنوری سے ہی اس بحث کے اس عنوان کو ”بھارت اور پاکستان کا مسئلہ“ (India-Pakistan Question) میں تبدیل کیا گیا۔ عنوان کی اس تبدیلی کی وجہ سے مسئلہ کشمیر کی نوعیت ہی بدلنے لگی اور یہ مسئلہ بھارت اور پاکستان کے مابین ایک علاقائی تنازعے کی شکل اختیار کرنے لگا۔

بھارت کا اہم اعلان۔ 15 جنوری 1948ء کو اقوام متحدہ میں بھارتی وفد کے قائد گوپال سوامی آئیئر نے سلامتی کونسل سے اپنے خطاب کے دوران بھارتی حکومت کی طرف سے

اعلان کیا کہ بھارت کشمیریوں کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ ریاست میں حالات معمول پر آنے کے بعد یہ فیصلہ کریں کہ وہ بھارت سے اپنے الحاق کو منسوخ کر کے پاکستان سے الحاق کریں یا خود مختار ہو کر اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کریں۔ انہوں نے اپنے اس اعلان کو سلامتی کونسل میں اپنی 3 فروری 1948ء کی تقریر میں بھی دہرایا۔ بھارتی وفد کے قائد کی 15 جنوری کی تقریر کے متعلقہ حصے کا متن (جو میں نے اقوام متحدہ کے آفیشل ریکارڈ سے لیا ہے) یہ عبارت سلامتی کونسل کی جنوری فروری 1948ء کی کارروائی پر مشتمل فائل کے صفحہ 29 پر درج ہے، مندرجہ ذیل ہے

".....Whether she (Kashmir) should withdraw from her accession to India and either accede to Pakistan or remain independent with a right to claim admission as a member of the United Nations--- all this we have recognised to be a matter of unfettered decision by the people of Kashmir after normal life is restored to them."

اقوام متحدہ کے کمیشن کا قیام۔ 20 جنوری 1948ء کو سلامتی کونسل نے "اقوام متحدہ کا کمیشن برائے بھارت اور پاکستان" (UNCIP) کے نام سے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جسے ہدایت کی گئی کہ وہ جلد از جلد برصغیر پہنچ کر بھارت اور پاکستان کی حکومتوں سے بات چیت کے ذریعے کشمیر میں ہونے والی جنگ کو بند کرادے۔ لیکن بھارت نے ٹال مٹول کے ذریعے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ کمیشن جولائی تک برصغیر نہ آسکا۔

کمیشن کی پہلی قرار داد۔ اقوام متحدہ کے کمیشن نے بھارت اور پاکستان کی حکومتوں سے مسلسل مذاکرات کے بعد اپنی پہلی قرار داد (13 اگست 1948ء) پر دونوں حکومتوں کی رضامندی حاصل کی۔ اس قرار داد کے تحت طے پایا کہ کشمیر میں جنگ بندی کرانے کے بعد وہاں اقوام متحدہ کی نگرانی میں رائے شماری کرائی جائے جس کے ذریعے کشمیری عوام اپنی ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔

کشمیر میں جنگ بندی۔ اقوام متحدہ کے کمیشن کی 13 اگست کی قرار داد کے تحت یکم جنوری 1949ء کو جنگ بندی عمل میں آئی۔

کمیشن کی دوسری قرار داد۔ 5 جنوری 1949ء کو اقوام متحدہ کے کمیشن نے ایک

کمیشن کی دوسری قرار داد۔ 5 جنوری 1949ء کو اقوام متحدہ کے کمیشن نے ایک اور قرار داد منظور کر کے اس پر دونوں حکومتوں کی رضامندی حاصل کر لی۔ اس قرار داد میں فوجوں کی واپسی وغیرہ کے پروگرام کی تفصیلات تھیں۔ البتہ یہ قرار داد 13 اگست والی قرار داد سے اس لئے مختلف تھی کہ اس میں مجوزہ رائے شماری کے دوران کشمیریوں کے اختیار (Choice) کو (پاکستان کی درخواست پر) ریاست کے بھارت یا پاکستان سے الحاق تک محدود کر دیا گیا تھا۔ جبکہ 13 اگست 1948ء والی قرار داد میں کشمیریوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔

گلگت پاکستان کی تحویل میں۔ 28 اپریل 1949ء کو حکومت پاکستان، حکومت آزاد کشمیر اور آزاد کشمیر کی حکمران جماعت (مسلم کانفرنس) کے مابین ہونے والے ایک معاہدے کے تحت ریاست جموں کشمیر سے متعلق حکومت پاکستان اور حکومت آزاد کشمیر کے حقوق، فرائض کا تعین کیا گیا۔ اس معاہدے کے تیسرے حصے کی شق نمبر VIII A کے تحت گلگت (معنی گلگت بلتستان) کے انتظامی امور عارضی طور پر حکومت پاکستان کی تحویل میں دیئے گئے۔ اس معاہدے پر حکومت پاکستان کی طرف سے اس کے مرکزی وزیر بے محکمہ (انچارج وزارت امور کشمیر) نواب مشتاق احمد گورمانی نے آزاد کشمیر حکومت کی طرف سے اس کے صدر سردار محمد ابراہیم خان نے اور آزاد کشمیر کی حکمران جماعت آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کی طرف سے اس کے سربراہ چوہدری غلام عباس نے دستخط کئے۔ اس معاہدے کے تحت مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر کشمیریوں کی نمائندگی کا حق بھی حکومت پاکستان کو دیا گیا۔

اقوام متحدہ کے کمیشن کی ناکامی۔ 1950ء میں اقوام متحدہ کے کمیشن برائے بھارت و پاکستان نے سلامتی کونسل کو رپورٹ دی کہ وہ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں سے اپنی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قرار دادوں کی فوجوں کے انخلاء سے متعلق شقوں پر عمل کرانے میں ناکام ہو گیا ہے۔

سرینگر میں آئین ساز اسمبلی کا قیام۔ مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے حکمران جماعت نیشنل کانفرنس کے فیصلے کے مطابق 1951ء میں آئین ساز اسمبلی قائم کی۔

ریاست کا اپنا صدر وزیر اعظم اور قومی پرچم۔ 1951ء میں قائم کی گئی آئین ساز اسمبلی نے ریاست کے لئے ایک آئین مرتب کیا جس کے تحت ریاست کا اپنا صدر، اپنا وزیر اعظم، اپنا قومی پرچم، اپنی قومی زبان (اردو) اور اپنے قوانین تھے۔ بھارت کے پاس

ریاست کے دفاع، امور خارجہ، مواصلات اور کرنسی سے متعلق معاملات تھے۔ یہ صورت حال تقریباً پندرہ سال تک قائم رہی۔ جس کے بعد بھارت نے ریاست کو (ریاست کے کٹہ پتلی لیڈروں کی مدد سے) صدر ریاست اور وزیر اعظم کے عہدوں اور ایسے دوسرے معاملات سے محروم کر دیا۔ چنانچہ آج مقبوضہ کشمیر کی آئینی حیثیت بھارت کی ریاستوں سے زیادہ مختلف نہیں۔

اقوام متحدہ کے نمائندوں کا تقرر - 1951ء سے لے کر 1958ء تک سلامتی کونسل کے ایک صدر جنرل میکناٹن (General Mc Naughton) اور سلامتی کونسل کی طرف سے یکے بعد دیگرے مقرر شدہ نمائندوں سیراؤن ڈکسن (Sir Owen Dixon) گنار جیرنگ (Gunar Jarring) اور ڈاکٹر فریگ گراہم (Dr Frank Graham) نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے بھارت اور پاکستان کی حکومتوں سے مذاکرات کئے لیکن انہیں کشمیر میں رائے شماری کرانے کے جملہ انتظامات پر دونوں حکومتوں کو متفق کرنے میں ناکامی ہوئی۔ جس کی اہم ترین وجہ بھارت کی بے جا ہٹ دھرمی تھی۔

نہرو عبداللہ معاہدہ - 1952ء میں بھارت اور کشمیر کے وزرائے اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو اور شیخ محمد عبداللہ کے مابین دہلی میں ایک معاہدہ ہوا۔ جس میں بھارتی حکومت نے وعدہ کیا کہ وہ ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی۔

شیخ عبداللہ کی برطانی اور گرفتاری - 9 اگست 1953ء کی صبح کو بھارتی حکومت نے مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کو ان کے عہدے سے معزول کر کے ان کے سینکڑوں ساتھیوں سمیت گرفتار کیا۔ بخشی غلام محمد کو ریاست کا نیا وزیر اعظم بنایا گیا۔ اس بھارتی کارروائی کے خلاف ہونے والے مظاہروں کے دوران بھارتی قابض فوج نے سینکڑوں کشمیریوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔

رائے شماری کا عہدہ نو - کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے کچھ مدت بعد پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے دہلی میں بھارتی وزیر اعظم سے مذاکرات کئے جن کے آخر میں اعلان کیا گیا کہ کشمیر میں رائے شماری کے لئے ضروری ابتدائی انتظامات (ناظم رائے شماری کا تقرر وغیرہ) اپریل 1954ء تک مکمل کئے جائیں گے۔ لیکن کشمیر میں حالات معمول پر لاتے ہی بھارت پھر اپنے وعدے سے مکر گیا۔

الحاق بھارت کی ”توثیق“ - 1957ء میں کشمیر اسمبلی نے کشمیر کے بھارت سے نام نہاد الحاق کو ”توثیق“ کی۔

مسئلہ کشمیر پر روسی ویٹو - روس مسئلہ کشمیر کے بارے میں سلامتی کونسل میں ہونے والی بحث کے ابتدائی دور میں غیر جانبدار رہا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے کشمیر پر بھارتی مؤقف کی حمایت کرنی شروع کی۔ یہاں تک کہ روس کے صدر اور وزیر اعظم نے مقبوضہ کشمیر کا دورہ کر کے ریاست کو بھارت کا آئینی حصہ قرار دیا۔ ادھر روس کی طرف سے ہنگری اور چکوسلوکیا کی عوامی تحریکوں کو فوجی طاقت سے دبانے پر بھارت کی خاموشی کے بدلے روس نے 1957ء اور 1962ء میں سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر پیش ہونے والی قرار دادوں (جن میں بالواسطہ طور پر کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی حمایت کی گئی تھی) کو ویٹو کر دیا۔

مسئلہ کشمیر پر پاک بھارت مذاکرات - 1962ء کی چین بھارت جنگ کے دوران کئے ہوئے وعدوں کے مطابق امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں نے بھارت کو مجبور کیا کہ وہ مسئلہ کشمیر کا حل ڈھونڈھنے کے لئے پاکستان سے مذاکرات کرے۔ چنانچہ 1963ء کے پہلے نصف تک ان مذاکرات کے چھ راؤنڈ ہوئے۔ بھارتی وفد کی قیادت ایک مرکزی وزیر سردار سورن سنگھ نے اور پاکستانی وفد کی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے کی۔ ان مذاکرات کے دوران کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی بجائے بات چیت مسئلہ کشمیر کو ”کچھ لو اور کچھ دو“ کے نام نہاد اصول کے مطابق حل کرنے پر ہوئی۔ ایک مرحلے پر وادی کشمیر میں دریائے جہلم کو پاک بھارت سرحد بنانے کی تجویز بھی پیش ہوئی۔ بہر حال یہ مذاکرات بھی مسئلہ کا کوئی حل نکالنے میں ناکام ہو گئے۔

پاک چین سرحدی معاہدہ - مارچ 1963ء میں پاکستان اور چین کے مابین ایک معاہدہ ہوا۔ جس کے تحت گلگت بلتستان اور چین کے مابین سرحد کی حد بندی کی گئی۔ گلگت بلتستان کے ان علاقوں کو متنازعہ ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہونے کی وجہ سے معاہدے کو مشروط قرار دیا گیا اور اسے مسئلہ کشمیر کے حل ہونے کے بعد وہاں قائم ہونے والی حکومت کی منظوری کے تابع بنا دیا گیا۔

موئے مبارک کی چوری - دسمبر 1963ء کے اواخر میں حضرت بل سری نگر سے نبی کریم کا موئے مبارک چوری ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں پوری وادی سراپا احتجاج بن گئی۔ حکومت مفلوج ہو گئی۔ آخر کئی دن بعد موئے مبارک کی بازیابی کا اعلان ہوا۔

شیخ محمد عبداللہ کا دورہ پاکستان -- اپریل 1964ء میں جیل سے رہائی کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے بھارتی وزیر اعظم سے مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کئے جن کے نتیجے میں انہوں نے پاکستان آکر پاکستان کے صدر محمد ایوب خان سے بھی مذاکرات کئے اور طے پایا کہ بھارت اور پاکستان کے سربراہان حکومت اور شیخ محمد عبداللہ دہلی میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں مذاکرات کر کے اس کا کوئی حل نکالیں۔ شیخ صاحب ابھی آزاد کشمیر میں ہی تھے کہ پنڈت نہرو کا اچانک انتقال ہو گیا۔ چنانچہ سربراہی مذاکرات کا یہ پروگرام بھی منسوخ ہوا۔

ریاست میں منصبوں کے ناموں میں تبدیلی - 1965ء میں مقبوضہ کشمیر میں صدر ریاست اور وزیر اعظم کے عہدوں کو گورنر اور وزیر اعلیٰ کے عہدوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ تبدیلی جی ایم صادق کے دور حکومت میں ہوئی۔

پاک بھارت جنگ - اگست 1965ء میں پاکستانی کمانڈو مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوئے۔ یکم ستمبر کو آزاد کشمیر فوج اور پاکستان آرمی نے چھب جوڑیاں کی طرف سے سرحد پار کی اور 6 ستمبر کو بھارت نے پاکستانی علاقوں پر حملہ کیا۔ 22 ستمبر کو جنگ بندی ہوئی۔

مسئلہ کشمیر پر سلامتی کونسل کی آخری قرارداد - پاک بھارت جنگ کے دوران اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اس پر بحث ہوئی۔ آخر 20 ستمبر 1965ء کی سلامتی کونسل کی قرارداد کو بھارت اور پاکستان کی حکومتوں نے تسلیم کر کے جنگ بندی کی۔ قرارداد میں کشمیر کا نام لئے بغیر ہی بھارت اور پاکستان کی حکومتوں پر زور دیا گیا تھا کہ وہ پاک بھارت جنگ کے پس منظر میں موجود مسئلے کو پر امن طریقے سے حل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔

اعلان تاشقند - 10 جنوری 1966ء کو روس کے شہر تاشقند میں صدر پاکستان محمد ایوب خان اور بھارتی وزیر اعظم مسٹر شاستری کے مابین ایک معاہدہ ہوا۔ جسے اعلان تاشقند کا نام دیا گیا۔ اس اعلان میں مسئلہ کشمیر کا ذکر صرف اس طرح ہے کہ فریقین نے پاک بھارت تعلقات کے پس منظر میں مسئلہ کشمیر پر بھی بات چیت کی۔

معاہدہ شملہ - 1971ء کی پاک بھارت جنگ (جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان پاکستان سے الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا) کے چھ ماہ بعد 2 جولائی 1972ء کو شملہ (بھارت) میں پاکستان

کے صدر ذوالفقار علی بھٹو اور بھارتی وزیراعظم مسز اندر اگانڈھی کے دستخطوں سے بھارت اور پاکستان کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس میں کشمیر سے متعلق مندرجہ ذیل معاملات طے پائے۔

(i) ریاست جموں کشمیر کے مستقبل کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے کے لئے مناسب موقع پر بھارت اور پاکستان کے حکام کے مابین مذاکرات کے نتیجے میں نکالے جانے والے مسئلہ کشمیر کے حل کی توثیق بھارت اور پاکستان کے سربراہان حکومت کریں گے۔ اس طرح یہ مسئلہ کشمیر کا حتمی حل ہو گا۔ اس معاہدے میں نہ تو کشمیریوں کے حق خود ارادیت کا کوئی ذکر ہے نہ ہی کشمیریوں کو مسئلہ کشمیر کا فریق تسلیم کیا گیا ہے۔

(ii) اس معاہدے کے تحت حد متارکہ جنگ (سینز فائر لائن) کا نام تبدیل کر کے لائن آف کنٹرول رکھا گیا۔ یہی نہیں بلکہ بھارت نے 1971ء کی جنگ کے دوران ریاست میں جن 22 اہم فوجی چوکیوں پر قبضہ کیا تھا وہ بھی اسے بخش دی گئیں۔ جس کے نتیجے میں اس نے بعد میں سیاچین گلشسر پر قبضہ کیا۔

(iii) دونوں حکومتوں نے اعلان کیا کہ وہ ایک دوسرے کی رضامندی حاصل کئے بغیر مسئلہ کشمیر کو کسی بین الاقوامی ادارے میں نہیں اٹھائیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد آج تک پاکستان نے مسئلہ کشمیر کو کسی بین الاقوامی ادارے یا کانفرنس کے ایجنڈے میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ علاوہ ازیں دونوں حکومتوں نے یہ بھی طے کیا کہ وہ اپنے ملک یا کشمیر میں اپنے زیر کنٹرول علاقے میں کسی ایسی تنظیم کو ابھرنے نہیں دیں گے جس کی سرگرمیاں فریق دوم کے خلاف ہوں۔

دہلی ایکارڈ - اداکل 1975ء میں بھارت کی وزیراعظم مسز اندر اگانڈھی اور کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ کے مابین ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس میں شیخ محمد عبداللہ نے ریاست جموں کشمیر کو بھارت کا آئینی حصہ اور الٹو انگ تسلیم کیا اور اس کے عوض اسے مقبوضہ کشمیر کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔

جنرل اسمبلی کے اندر تاریخی احتجاج - 3 اکتوبر 1980ء کو میرے بنائے ہوئے

منصوبے کے مطابق لبریشن فرنٹ کے چار مجاہدوں جاوید بھٹی، محمود احمد، مشتاق خان اور محمد یاسین نے نیو یارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بھارتی وزیر خارجہ کی تقریر کے دوران پندرہ بیس منٹ تک آزادی کشمیر کے فلک شکاف نعرے لگا کر ہال میں موجود دنیا کے تمام ممالک کے وزرائے خارجہ اور سینئر سفارت کاروں اور دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کی اہمیت کا احساس دلایا (تفصیلات کے لئے دیکھئے اقوام متحدہ میں

سرگرمیاں والے باب کا متعلقہ حصہ)

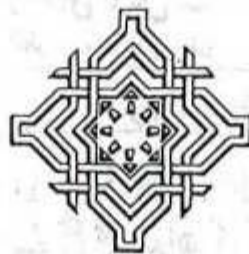
کشمیریوں سے زیادتی کرنے والوں کا حشر

اسے اتفاق کہئے یا مکافات عمل کہ جس کسی نے بھی کشمیریوں کے ساتھ زیادتی کی یا ان کے قومی مفاد کو نقصان پہنچایا یا پہنچانے کی کوشش کی اسے قدرت کی طرف سے عبرت ناک سزا ملی خواہ وہ کشمیری تھا یا باہر کا۔ اس سلسلے کی سینکڑوں مثالوں سے کچھ۔

کشمیر کو کشمیریوں کی مرضی کے خلاف بھارت کے حوالے کرنے والا مہاراجہ ہری سنگھ بمبئی میں گمنامی کی موت مر گیا۔ نام نہاد کشمیر اسہلی سے ریاست کے بھارت سے نام نہاد الحاق کی توثیق کرانے والے بخشی غلام محمد کو انتہائی تذلیل کے ساتھ اقتدار سے علیحدہ کیا گیا اور اس کے مرنے پر عوام نے اس کی تجہیز و تکفین میں حصے لینے سے انکار کیا۔ کشمیری حریت پسندوں کو انسانیت سوز جسمانی اور ذہنی اذیتیں دینے والے پولیس آفیسر قادر گاندر بلی کے بدن میں کیڑے پڑ گئے اور وہ اسی حالت میں مر گیا۔ ریاست کی چیف منسٹری کی لنگڑی کرسی کے عوض ریاست کو بھارت کا آئینی حصہ تسلیم کرنے والے شیخ محمد عبداللہ کی قبر پر پہرہ بٹھانا پڑا۔ یہ وہ شیخ محمد عبداللہ ہے جو اگر اس قسم کی غلطیاں نہ کرتا تو صدیوں تک کشمیریوں کے دلوں پر حکومت کرتا۔ جدوجہد آزادی کو سیاسی آوارہ گردی قرار دینے والے مرزا افضل بیگ زندگی کے آخری سالوں میں اپنوں ہی کے ہاتھوں ذلیل ہو گئے۔ مسئلہ کشمیر کو درد سر قرار دینے والا فیلڈ مارشل ایوب خان اپنے دور اقتدار کے آخری مہینوں میں اپنے ہی پروردہ افراد کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوا۔ شملہ میں کشمیریوں کو ان کے پیدائشی حق (حق خود ارادیت) سے محروم کرنے کے معاہدے پر دستخط کرنے والا ذوالفقار علی بھٹو اپنے ہی پروردہ کے ہاتھوں سولی چڑھ گیا اور کشمیریوں کو ہمیشہ کے لئے غلام بنانے کے خواب دیکھنے والی مسز اندرا گاندھی کا جسم اپنے ہی محافظوں کی گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔

مکافات عمل کی یہ چند مثالیں مشتے از خروارے ہیں۔ انشاء اللہ کشمیریوں کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کا آئندہ بھی یہی حشر ہوتا رہے گا۔

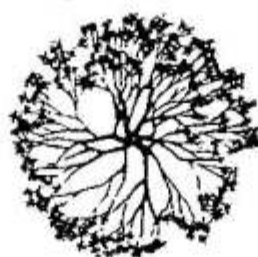




حصه مفتوم



دستاویزات



ریاستوں کی خود مختاری کے بارے میں قائد اعظم کا بیان

INDIA OFFICE LIBRARY AND RECORDS						Reference	Copyright photograph - not to be reproduced photographically without permission of the India Office Library and Records
1	2	3	4	5	6	COL KOR V 17395 WLX1	

438

THE TRANSFER OF POWER

225

Report from Reuters Indian Service

L/P&S/13/1827: ff 8-9

MR JINNAH'S STATEMENT

NEW DELHI, 17 June 1947

Mr Mohammed Ali Jinnah, Moslem League President, in a statement today on the position of the Indian States after the lapse of paramountcy, said: "Constitutionally and legally the Indian States will be independent sovereign States on the termination of paramountcy and they will be free to decide for themselves any course they like to adopt."

"It is open to the States to join the Hindustan Constituent Assembly or the Pakistan Constituent Assembly or decide to remain independent. In the last case they can either enter into such arrangement or relationship with Hindustan or Pakistan as they may choose," Mr Jinnah said.

Mr Jinnah said if the States wished to remain independent and wished to negotiate or adjust any political or any other relationship such as commercial or economic relations with Pakistan "we shall be glad to discuss with them and come to a settlement which will be in the interests of both".

He added that he was not of the opinion that the States were limited only to the option of joining one or other Constituent Assembly.

"In my opinion they are free to remain independent if they so desire. Neither the British Government nor the British Parliament nor any other power or body can compel them to do anything contrary to their free will and accord, nor have they any power of sanction of any kind to do so", he said.

226

Report of the Madras States Residency for the fortnight ending 15th June 1947
(Extract)

L/P&S/13/1299: f 4

TRIVANDRUM, 17 June 1947

TRAVANCORE

1. The question of independence of States after the lapse of British paramountcy, with particular reference to Travancore, has been the subject of sharp controversy between Sir C. P. Ramaswami Aiyar on the one side and leaders of the Congress and All-India States' People's Congress parties on the other. Through Press Conferences and Press statements, the Dewan has

29 اپریل 1949ء کے معاہدہ کراچی کا متن جس کے تحت گلگت بلتستان اور مسئلہ کشمیر سے متعلق معاملات کو حکومت پاکستان کی تحویل میں دیا گیا

HEADS OF AGREEMENT WITH HON'BLE MINISTER WITHOUT PORTFOLIO AND THE PRESIDENT
ALL J&K MUSLIM CONCERENCE AND THE PRESIDENT AZAD KASHMIR GOVT.

III. Division of functions between the Government of
Pakistan and Azad Kashmir Government and the
All J&K Muslim Conference.

A. Matters with the purview of the Pakistan Government.

I. Defence (as modified under C.R. No. 149/49).

II. Foreign Policy of Azad Kashmir. III. Negotiations with UNCIP.

IV. Publicity in Foreign countries and in Pakistan V. Coordination of arrangements of relief and Rehabilitation of Refugees. VI. Coordination of publicity in connection with Plebiscite. VII. all activities within Pakistan regarding Kashmir such as procurement of food, civil supplies, transport, running of refugee camps and medical aid. VIII. All affairs of Gilgit, Ladakh under control of Political Agent.

B. Matters with the purview of AK Government.

I. Policy with regard to administration of AK Territory. II. General supervision of administration in AK Territory III. Publicity with regard to the activities of Azad Kashmir Government and administration. IV. Advise to Hon'ble Minister without Portfolio with regard to the negotiations with UNCIP. V. Development of economic resources of AK Territory.

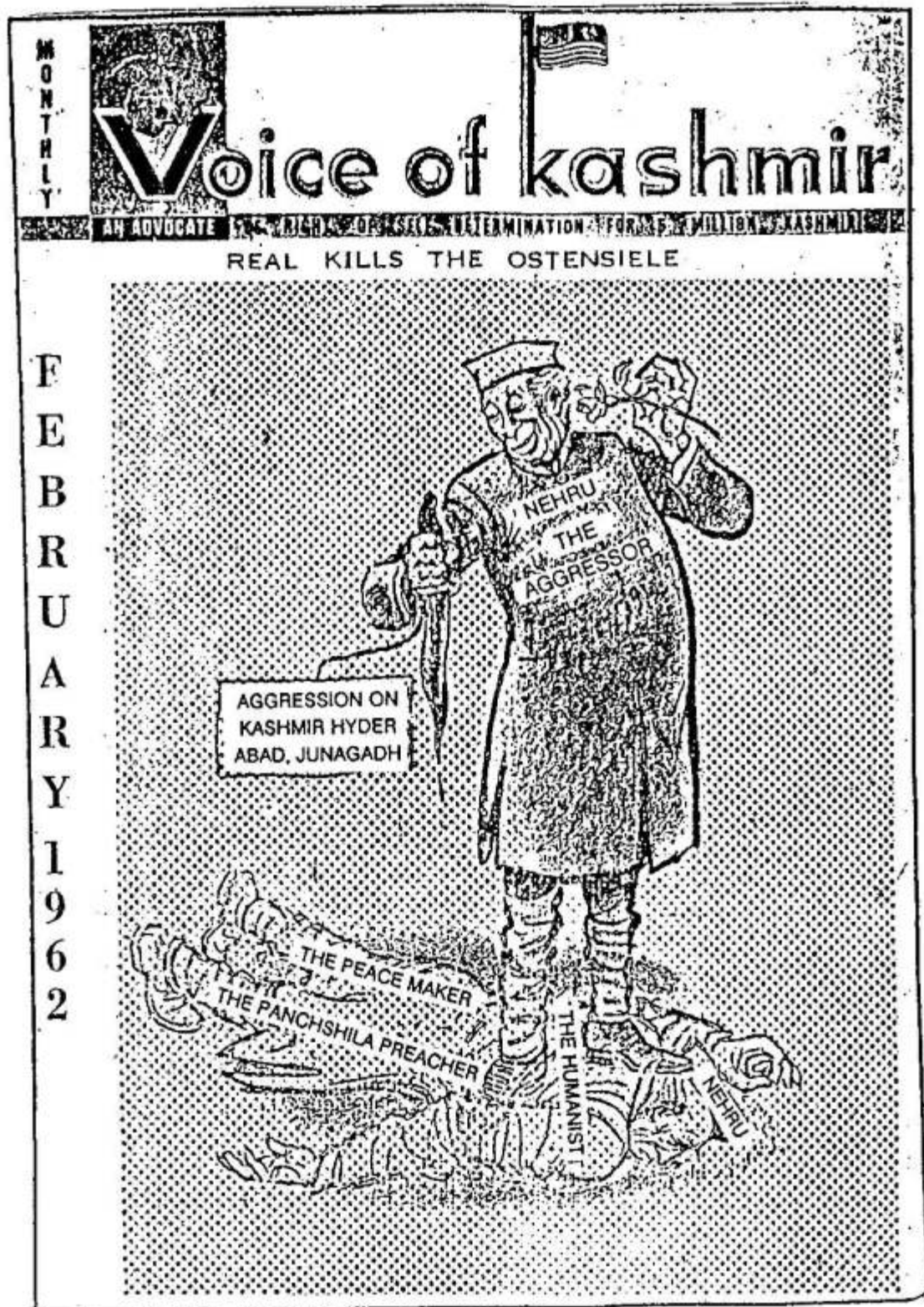
C. Matters with the purview of Muslim Conference

I. Publicity with regard to Plebiscite within AK Territory II. Field work and publicity in the Indian occupied area of the State III. Organization of Political activities in the AK Territory in Indian occupied area of the State IV. Preliminary arrangements in connection with the Plebiscite. V. Organization of contesting the Plebiscite. VI. Political work and publicity among the Kashmiri refugees in Pakistan. VII. Advise the Hon'ble Minister without Portfolio with regard to the negotiations with UNCIP.

I agree to this in so far as this
concerns with the part regarding
the Muslim Conference
Sd/- Ghulam Abbas
President,
All J&K Muslim Conference.

Sd/- Mohd. Ibrahim Khan
President,
Azad Kashmir Government.

Sd/-
(M. A. Gurmani)
Minister without Portfolio
Government of Pakistan



حکومت پاکستان کے یہ دو خط جو گنگا ہائی جیننگ کیس کے دوران عدالت میں پیش کئے گئے
حکومت کی کشمیر پالیسی کا اصل چہرہ دکھاتے ہیں

GOVERNMENT OF PAKISTAN
MINISTRY OF HOME, KASHMIR AFFAIRS
AND STATES AND FRONTIER REGIONS
(KASHMIR AFFAIRS DIVISION)

SUMMARY FOR THE PRESIDENT & C.M.L.A.

Subject:- UNDER-GROUND ACTIVITIES OF PLEBISCITE FRONT

The Jammu and Kashmir State Plebiscite Front for Azad Kashmir and Pakistan believe in "Independent Kashmir" ideology and for bringing about the resolution of the Kashmir dispute, its workers speak of resorting to disruptive/sabotage activities in Occupied Kashmir. Its important workers are:-

- (1) Mr. Amanullah Khan of Karachi.
- (2) Mr. Ghulam Mohammad Loan of Karachi.
- (3) Mir Abdul Mannan of Karachi.
- (4) Mir Abdul Qayyum of Karachi
- (5) Mr. Maqbool Ahmad Butt President of the Front.

2. Mr. Amanullah Khan and others organised an adventure in Indian-held Kashmir in 1966, in which Messrs. Maqbool Ahmad Butt, Yasin and Kala Khan were intercepted and convicted to death. Messrs. Amanullah Khan, Maqbool Ahmad Butt and Kala Khan succeeded in escaping back to Azad Kashmir.

3. After the convention of the J&K Plebiscite Front at Muzaffarabad on November 5th to 6th, they have planned to resort to armed action in Occupied Kashmir and to accomplish their plans, they are reported to be collecting arms and ammunition and explosives and to recruit people to carry these into Occupied Kashmir for sabotage. A cyclostyled copy of their plan is enclosed.

4. It is considered that Amanullah Khan and his workers are undesirable persons and should be told by the intelligence authorities in clear terms that their private efforts at liberating Occupied Kashmir will not be tolerated: and if they do not desist, the ring-leaders should be arrested and detained.

Sd/- (A.M.S. Ahmad)
S. Pk. PSP.,
SECRETARY.

FROM CDR. IZZAT AWAN
DEPUTY SECRETARY

IMMEDIATE

GOVERNMENT OF PAKISTAN
MINISTRY OF HOME & KASHMIR AFFAIRS
(KASHMIR AFFAIRS DIVISION)
D.O. No P-1/21/69 ISLAMABAD THE 24TH DECEMBER 1969.

SUB:- UNDERGROUND ACTIVITIES OF PLEBISCITE FRONT

Dear Mr. President,

I am desired to forward herewith a copy of the summary prepared in this Division on the subject and to convey the following decision taken in this respect by the Government of Pakistan:-

1. "The Government of A.K. is to handle the situation according to merits and their Intelligence appreciation. The Government of Pakistan would come in if A.K. Government encounter any difficulty and only on their recommendation."
- "Mr. Amanullah and his workers should be told in clear terms that their private efforts in liberating J.H.K. will not be tolerated. If they do not desist, the ring leaders should be arrested and detained."
2. It is therefore requested that suitable measures may kindly be taken to counteract their mischief.
3. You may have also seen the Intelligence report on the annual Convention of the Front held at Muzaffarabad from November 4 to 6, 1969 and the role played by Mr. Amanullah and his other workers. A note each on Mr. Amanullah Khan and Mr. Abdul Mannan Khalifa and the activities of the Jammu and Kashmir Plebiscite Front and Kashmir National Liberation Front is also enclosed for information.

With respectful regards,
Yours sincerely,
Sd/-
(IZZAT AWAN.)

Encl:- Attached.

Mr. Abdul Rehman Khan,
President,
Azad Govt. of the State of J&K
Muzaffarabad (Azad Kashmir)

گنگا ہائی جینگ کس کے فیصلے میں میرے اور نظریہ خود مختار کشمیر کے بارے میں ریمارکس

AMANULLAH KHAN

271

To understand fully the ideology of the Plebiscite Front and National Liberation Front, we must advert also to some of the associates of the accused. The foremost of them is Amaullah Khah.

Amanullah Khan, D.W 40, commonly known as Amanullah Gilgiti belongs to Astore in Gilgit Agency. He left his home village as a child and went to Hi Hama where he stayed with his sister

272

are given free tuition. He is also maintaining a hostel for these boys. By putting in untiring efforts he has got sanctioned by the Government scholarship for the boys of Gilgit-Baltistan. Some Scholarships are given by him personally.

Amanullah Khan writes with great facility and at times very artfully. He projects political views with telling effect and has tremendous capacity for organizational work. He has been in correspondence not only with the leaders of political parties in in Pakistan and Indian Held Kashmir since 1957, but also with the officials of the United Nations Organization the Afro Asian Conference, and a large number of Kashmiri Students carrierist residing in U.S.A. England and other foreign countries. He has also been in constant correspondence with Sheikh Mohammad Abdullah, Mirza Afzal Beg and Maulana Masoodi.

338

on both sides of the cease fire line.

It was conceded by the learned Attorney General that the demand for Independent Kashmir made by the accused was no offence in law and as members of a political party they were entitled to canvass for this yiew.

This disposes of the second part of the fifth charge, but we would like to make a few observations before we pass on to the next charge.

The mission undertaken by the accused is two-fold. On the one hand they want to liberate held part of the Kashmir from Indian occupation forces, and on the other to indoctrinate the Kashmiris against accession of the State to Pakistan. While dealing with the antecedents of Amanullah Gilgati who is the main intellectual force behind the Plebiscite Front and National Liberation Front, we have quoted from the letter he had written



CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

cms/Secy-18/78.

محکمہ اعلیٰ افسانہ و امور

نمبر
3 اگست 1978

السلام علیکم

سب کو خط مؤرخہ ۱۸ جولائی ۱۹۷۸ء کو ارسال ہوا تھا جس میں اس خط میں کشمیر کی خود مختاری کو آئینہ قانون کے لئے ایک روشن مستقبل کی ضمانت کے طور پر پیش کیا ہے۔ لیکن اس امر کے لئے آپ نے جس جوازیت اور سب سے بڑھ کر جس جذباتیت کا سہارا لیا ہے، میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ جذبات کے سہارے کسی ایک فرد یا ادارہ کے مقصد کا فیصلہ کرنا یا سکتا ہے لیکن کسی قوم کے آزادی کی اجتماعی قسمت کا تعین کرتے وقت جذبات سے زیادہ حقیقت پسندی کا رویہ اپنانا پڑتا ہے۔ آپ نے اپنے دلائل میں حقیقت پسندی کے اس اہم عنصر کو مرثیہ فلسفہ رائے انداز کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا خط عین آپ کے ذاتی نقطہ نظر کا ترجمان بن کر رہ گیا ہے اور اس سے کسی نئی تعمیر یا اجتماعی فکر کا آغاز نہیں ہوتا۔

جہاں تک کشمیر کی خود فی دہی کا سوال ہے، میں آپ کی توجہ اُن چند باتوں کی طرف دلاتا ہوں جو بڑھاپا ہونے لگا ہوتا ہے۔ بلکہ تردید ساز کن حقائق میں ڈھل چکی ہیں اور ہماری تاریخ کا کوئی بھی سنجیدہ طالب علم اُن سے چشم پوشی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ہم نے کئی بار شخص راج کے خلاف عسکر یک شریعت کی تہذیب کو دیکھا ہے۔ وقت ہمیں اُن عظیم سائنسدانوں کا نشانہ اور راہنمائی حال رہی جو اُس وقت کے ہندوستان میں انگریز سامراج کے خلاف آزادی کی جنگ میں معروف تھے۔ اس طرح ہندوستان کی جنگ آزادی میں مختلف القیاد جہادوں کا وارث اثر انگیز رنگ پھیلا ہوا تھا۔ برصغیر کی تعلیم کے فوری پھول ہم تاریخ کے ایک نادر اور اہم ترین نمونہ بن گئے۔ یہی وہ نظام تھا جس پر ہمارے سامنے تین راستے تھے۔

ایک راستہ تھا کہ ہم ہندوستان کے ساتھ اُلٹ کر بن جائیں۔ ہمارے حرام کے میکر اور نیشہ کش کر دار کی روشنی میں یہ فیصلہ ہم بھی تھا اور اس سے ہمارے بنیادی آرزوئوں کو بھی تقویت پہنچتی تھی۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ ریاستی حرام کے مسلم اکثریتی کو ہم پر پیش نظر پاکستان میں شامل ہوا جائے۔ تیسرا راستہ خود فی دہی یا مکمل آزادی کا تھا جس کے لئے ہم حمایہ ملک کا رکن سے تحفظ کی ضمانت ضروری تھی۔ لیکن ابھی ہم اس بارے میں سوچ رہے ہیں۔



CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

۲۰

پاکستان نے ریاست میں ہمارے مزاحمت کر دی۔ یہ ایک ایسی صورت حال بنی جس میں ہندوستان نے ہماری مدد کی اور ہمیں داخلی خود مختاری کے ایک واضح تصور کے تحت خارجی مزاحمت کی صورت میں ہر ممکن تحفظ دینے کی ضمانت فراہم کی۔ ہندوستان کی طرف سے دی گئی یہ ضمانت خود ہندوستان کے وفاقی دستور میں موجود ہے اور اس کی روشنی میں ریاستی عوام کے لئے بہت زیادہ محفوظ مستقبل کا ایک جائز اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ بین الاقوامی پس منظر میں بھی آپ بڑی واقف ہیں کہ آج دنیا کی چھوٹی ریاستیں اور ملکات اپنی سالمیت اور آزادی کے تحفظ کے لئے اپنے شاہی بڑے ملک پر انحصار کرتے ہیں، البتہ ہونے کی صورت میں ان کی آزادی اور سالمیت ہمیشہ خط سے رہتی ہے، برصغیر کے کچھ چھوٹے ممالک اور براعظم فریق کی نئی آزاد مملکتوں میں پیش آنے والے روزمرہ کے واقعات اس امر کے شاہد ہیں۔ دوسرے نظروں میں ان کے عادیت کا رجحان ہر جمعہ عالمی سیاست کی ایک غالب حقیقت بننا جاری ہے اور یہ ہندوستان سے ہماری وابستگی کے بنیادی فیصلے کی استقامت کو بھی ٹھہرنا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر اپنی جغرافیائی حدود کے اعتبار سے کئی عظیم الٹا لٹا ملک سے گھری ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں خود مختاری کا جو تصور آپ نے پیش کیا ہے وہ ایک مستقل خط سے بچا ہوا اور کچھ بھی فراہم نہیں کر سکتا، اور اسی لئے ہم نے خود کو ہندوستان کی وسیع وفاقی جمہوریت سے وابستہ رکھا ہے۔ یہ قدم ریاست کی سالمیت اور ریاستی عوام کی اجتماعی بہتری کی ضمانت کے طور پر اٹھایا گیا ہے اور آزادی کے بعد برسوں میں ہمارے عواموں پر بھی پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں جن میں بڑے بڑے کشمکش کا قیام بھی شامل ہے، ہمارے اس فیصلے کی سچائی بہت حد تک عیاں ہو گئی ہے۔

آپ نے مسیحا کی ذاتی قربانیوں کے ساتھ ساتھ قومی تحریک میں میری کچھ خدمات کا ذکر کیا ہے۔ اور مستقبل کا سوال بھی اٹھایا ہے۔ قزاقوں کی زندگی میں کوئی بھی ایک انسان اتنا بڑا نہیں ہوتا کہ اس کی شخصیت مستقبل میں چرچیں آنے والے واقعات کے تسلسل کا رخ موڑ سکے اور مجھے اس بارے میں اپنی ذات سے متعلق کوئی بھی خوش فہمی سمجھتا ہے۔ میں نے ہمیشہ ریاستی عوام کے مجموعی مفادات کو اپنی ذات سے بالاتر سمجھا ہے اور میں آپ کو یقین دلانا ہوں



CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

۱۲۱

کہ جب تک مجھے اپنی قوم کی خدمت کا موقع نہ ملے گا، میں راہنمائی ہر قدم ایک باعزت اور خوشحال
معاشرے کی تعمیر کے لئے وقف ہو گا۔ یہی مسیر مقصد ہے اور اسی سے ریاستی حکام کو اُن کا تاریخی و قس
اور عظمت دوبارہ حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اُن کے صدیوں پرانے مابلیٰ کامل ممکن ہو سکتا ہے۔

نیکو خواہشات کے ساتھ!

دعاگو

(شیخ محمد رفیع)

شیخ محمد رفیع صاحب

جناب امارت الشیخات
۱۲۸۸ م ۱۲ راکے سرگودھا
برمنگھم
ایڈوکیٹ
تفصیل

اقوام متحدہ کی طرف سے ملنے والے درجنوں خطوط میں سے کچھ

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

POSTAL ADDRESS—ADRESSE POSTALE: UNITED NATIONS, N.Y. 10017
CABLE ADDRESS—ADRESSE TELEGRAPHIQUE: UNATIONS NEW YORK

REFERENCE

17 August 1978

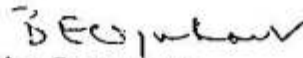
Dear Mr. Khan,

On behalf of the Secretary-General I acknowledge receipt of your letter of 26 June 1978, in which you make certain suggestions concerning the future of Kashmir and ask the Secretary-General to take specific action in that regard.

As you know, the question of Kashmir has been for a long time the subject of consideration within the United Nations, and a number of resolutions on that subject have been adopted over the years. These resolutions dealt with this problem in the context of relations between India and Pakistan. For example, following the 1965 hostilities in Kashmir, the Security Council on 20 September of that year called upon the two Governments to utilize all peaceful means towards a settlement of the political problem underlying that conflict. You are also no doubt aware that the Simla Agreement of 2 July 1972 provides for discussions between the two Governments toward a "final settlement of Jammu and Kashmir". It is our understanding that contacts on the subject are continuing.

In the light of this background, we can see no basis or legislative authority for an initiative by the Secretary-General designed to influence the two Governments directly concerned to adopt a solution of the problem under negotiation between them along the lines favoured by one or another political party in the area. The Secretary-General hopes that an agreed solution of the problem of Kashmir and other outstanding problems will be reached by negotiations, in the interests of permanent peace on the subcontinent.

Sincerely yours,



Brian E. Urquhart
Under-Secretary-General for
Special Political Affairs

Mr. Amanullah Khan
Secretary-General
Jammu Kashmir Liberation Front
438 Alum Rock Road
Birmingham 8, U.K.

مسلم
13/11

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

POSTAL ADDRESS—ADRESSE POSTALE UNITED NATIONS, N.Y. 10017
CABLE ADDRESS—ADRESSE TELEGRAPHIQUE UNATIONS NEW YORK

REFERENCE:

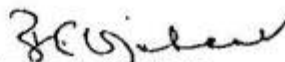
13 November 1978

Dear Mr. Khan,

Thank you for your letter of 11 September. Your views have been carefully noted. In this regard I must again draw your attention to Security Council resolution 211, of 20 September 1965, in which the Council decided that, following the cessation of hostilities, it would "consider...what steps could be taken to assist towards a settlement of the political problem underlying the present conflict, and in the meantime call(ed) on the two Governments to utilize all peaceful means, including those listed in Article 33 of the Charter of the United Nations, to this end". As you know, the two Governments on 2 July 1972 concluded the Simla agreement. Any further United Nations action on this matter would be for the Council to decide.

Concerning the request for circulation of your communications, I have to inform you that under UN rules this could only be done at the request of a Member State. However, your letter will be included in a list of such communications that is circulated by the Secretary-General from time to time, and the letter itself will then be available for consultation by members of the Security Council.

Sincerely yours,



Brian E. Urquhart
Under-Secretary-General for
Special Political Affairs

Mr. Asanullah Khan
Secretary-General
Jammu Kashmir Liberation Front
438 Alum Rock Road
Birmingham 8, U.K.

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

POSTAL ADDRESS—ADRESSE POSTALE UNITED NATIONS, N. Y. 10017
TELEPHONE ADDRESS—ADRESSE TELEPHONIQUE UNITED NATIONS, NEW YORK

REFERENCE PO 240 PI (S/RC) 1980

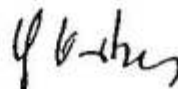
31 October 1980

Dear Sir,

On behalf of the President of the Security Council, I wish to acknowledge receipt of your letter dated 28 October 1980 concerning the India-Pakistan question and to thank you for having conveyed your views on this problem.

Please be assured that your letter will be dealt with in accordance with established procedures for dealing with communications from private individuals and non-governmental bodies, which ensure that representatives on the Security Council will have an opportunity to acquaint themselves with the contents of your communication.

Yours sincerely,



Director
Security Council and
Political Committees Division

Mr. Amanullah Khan
Secretary-General for
Jammu Kashmir Liberation Front
3021 'I' No. 2 A
Brooklyn, N.Y. 11210

..... P.S. Kindly refer to Article 35 of the U.N. Charter (copy enclosed) regarding the convening of a Security Council meeting.

جہاں

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

PORTAL ADDRESS—ADRESSE POSTALE: UNITED NATIONS, N.Y. 10011
CABLE ADDRESS—ADRESSE TELEGRAPHIQUE: UNATIONS NEWYORK

REFERENCE:

11 November 1980

Dear Mr. Khan,

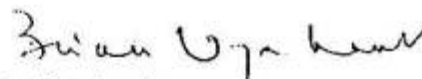
On behalf of the Secretary-General, I wish to acknowledge receipt of your letter of 30 September 1980. While your remarks concerning the United Nations attitude toward the issue of Jammu and Kashmir have been noted, we cannot accept your contention that the Organization has shown apathy towards Kashmir.

The Kashmir problem was dealt with at length by the Security Council from 1948 to 1951, and again in 1965 and in 1971. The continued stationing in Kashmir of the United Nations Military Observer Group for India and Pakistan (UNMOGIP) symbolizes the concern of this Organization over the situation.

As you are aware, any further action by the United Nations in this matter would have to be decided upon by the Security Council.

As I have had occasion to explain in previous letters, documents are normally circulated at the United Nations upon the request of a Member State. Your letter, however, will be kept on file and will be available for consultation in accordance with established procedure.

Sincerely yours,



Brian Urquhart
Under-Secretary-General
for Special Political Affairs

Mr. A. Khan, Secretary General
Jammu Kashmir Liberation Front
Head Office
438 Alum Rock Road
Birmingham 8
United Kingdom

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

POSTAL ADDRESS — ADRESSE POSTALE UNITED NATIONS, N.Y. 10011
CABLE ADDRESS — ADRESSE TELEGRAPHIQUE UNITED NATIONS NEW YORK

REFERENCE PO 240 PI (S/MC) 1980

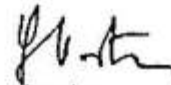
3 December 1980

Dear Mr. Khan,

On behalf of the Secretary-General, I wish to acknowledge receipt of your letter dated 14 November 1980 concerning the India-Pakistan question and to thank you for having conveyed your views on this problem.

Please be assured that your letter will be dealt with in accordance with established procedures for dealing with communications from private individuals and non-governmental bodies, which ensure that representatives on the Security Council will have an opportunity to acquaint themselves with the contents of your communication.

Yours sincerely,



Director
Security Council and
Political Committees Division

Mr. Amanullah Khan
Secretary General
Jammu Kashmir Liberation Front
3021 Avenue, 'I' No. 2 A
Brooklyn, N.Y. 11210

P.S. In regard to your previous request for the convening of a Security Council meeting, kindly refer to Article 35 of the United Nations Charter (copy enclosed).

جید مسلسل

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

POSTAL ADDRESS—ADRESSE POSTALE: UNITED NATIONS, N.Y. 10011
CABLE ADDRESS—ADRESSE TELEGRAPHIQUE: UNATIONS NEW YORK

REFERENCE:

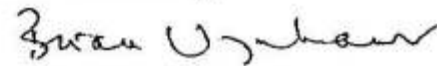
4 October 1984

Dear Mr. Khan,

On behalf of the Secretary-General, I should like to acknowledge receipt of your letter of 28 September 1984 in which you reiterated your views on the question of the future of Jammu and Kashmir and asked the Secretary-General to take specific action in that regard.

In previous correspondence with you we have had occasion to explain the position of the United Nations concerning the present status of this question. As was again pointed out to you by a member of this office on 28 September, that position remains unchanged. Any further action on this matter would have to be initiated in the Security Council by a Member State of the Organization.

Yours sincerely,



Brian Urquhart
Under-Secretary-General
for Special Political Affairs

Mr. Amanullah Khan
Chairman
Jammu Kashmir Liberation Front
Kashmir House
44 Westbourne Road
Luton LU4 8JD
England

BMS.80/C (4-62)

UNITED  NATIONS
TEMPORARY MASS

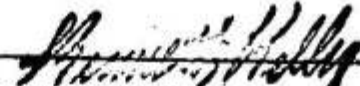
میرا اقوام متحدہ کا پاس

MR. Amanullah Khan

REPRESENTATIVE OF Voice of Kashmir

Issued 23 Sep 83 Expires 23 Oct 1983

AUTHORIZED SIGNATURE


THIS PASS IS PERSONAL AND MUST BE SHOWN ON DEMAND OF AUTHORIZED PERSON.
KINDLY RETURN TO PASS OFFICE UPON EXPIRATION DATE OR FINAL DEPARTURE.

خالفستان کی جلا وطن حکومت کے صدر کا خط

ਮਤਿਗੁਰ ਪ੍ਰਸਾਦ



ਰਿਪਬਲਿਕ ਆਫ਼ ਖਾਲਿਸਤਾਨ
REPUBLIC OF KHALISTAN

KHALISTAN HOUSE
12 Talbot Road,
London W2 5LH
Tel: 01-221 3859

Dated: 26.10.84..

Jammu & Kashmir Liberation Front,
Kashmir House,
44 Westborne Road
Luton LU4 8JD England.

Dear Khan Sahib,
Aslam-e-Aleka.

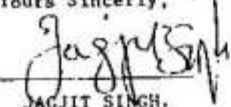
Thankyou very much for your kind letter of October 18th, Ref.No:CM/POL/155/84.

I already have issued statements to the facts that Khalistan has got no claim to any territory of Pakistan or Kashmir State. The statements, have already been published twice in all the Islamic press. I also sent a copy of my statement to Pakistan Embassy, (copy sent here-with).

There is a group of professors in Lahore University, who along with the Indian Intelligence are always trying to publish such news or maps. Our map is published in almost every issue of Khalistan Times and you can assure your party that Khalistan will be a friendly state to Kashmir.

Thanking You.

Yours Sincerely,


JAGJIT SINGH.

President
Republic of Khalistan.

JAMMU KASHMIR LIBERATION FRONT



جموں کشمیر لبریشن فرنٹ

HEAD OFFICE
438 Alum Rock Road
Birmingham 8, U.K.
Tel: 021-328 2647

Date: Sept. 27, 1983

Their Excellencies,
The Foreign Ministers of the NAM Member States,
Camp New York.

Your Excellencies,

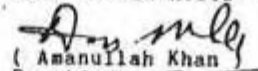
Reminding Your Excellencies of the provisions of the Aims and Objectives of the Non-Aligned Movement and of the UN General Assembly Resolutions 1514 and 2621 (Granting of Independence to Colonial Countries and Peoples) which make it obligatory for all member states to render all necessary moral and material assistance to the freedom movements of the enthralled peoples, I venture to call upon Your Excellencies to use your good offices to persuade the governments of India and Pakistan to concede to 9 million Kashmiris their inherent, inalienable, pledged and internationally recognised right of self-determination.

In the light of the nature and background of the issue and the lame excuses being made about impracticability of the plebiscite provided under UNCIP resolutions on the issue, the best, most equitable and practicable way to solve it is to re-unify the forcibly divided Jammu Kashmir State and let it emerge as a free and independent State.

It may be mentioned here that both India and Pakistan stand committed to this solution through their nationally and internationally made declarations. India had declared even at the United Nations that she fully recognised Kashmiri peoples right to complete independence and to claim admission to the United Nations as a member State. (Indian representatives speech in the Security Council on January 15 and February 3, 1948)

I hope Your Excellencies will not ignore your above-mentioned moral and constitutional obligations.

Your Excellencies' faithfully,


(Amanullah Khan)
President,
Jammu Kashmir Liberation Front

رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے دو خط

المجلس الإسلامي في أوروبا
Islamic Council of Europe

4th June 1979

Mr. Amanullah Khan
Jammu Kashmir Liberation Front
438 Alum Rock Road,
Birmingham 8

Dear Brother Khan

Assalamu Alaikum wa Rahmatullah,

We wish to express our heartfelt thanks and gratitude to you for attending the International Islamic Conference on the Liberation of Muslim Lands. Your valuable efforts greatly contributed to the success of the Conference.

You will be pleased to know that in pursuance of the resolution passed at the Conference, the International Islamic Secretariat for the Liberation of Muslim Lands have been set up and we hope with your active participation and cooperation, we will, Insha Allah, realise our noble aims.

Please find enclosed the copy of the text of the resolutions passed at the Conference.

May Allah guide and reward you and bring success to all your efforts.

With regards and best wishes.

Yours Sincerely,

Salem Azzam
Salem Azzam
Secretary General

بسم الله الرحمن الرحيم
واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرقوا

الرقم ١٦٨٧
(٨/١/١٤٢٨هـ)

التاريخ ١٤٢٨/١/٨

الرفقات

الموضوع : قضية المسلمين في الهند وكشمير

البيّنة العامة للإسلام

الأمانة العامة

ادارة أعمال المجلس التأسيسي
والمؤتمرات

المختبر
سعاد قاسم / امان الله خان
أمين عام جبهة تحرير جامو وكشمير / برمنجهام / إنجلترا
السلام عليكم ورحمة الله وبركاته :

إشارة إلى خطابكم المؤرخ في ٢٢ / ٨ / ١٩٨٠م المرفق به تقرير عما تقتضيه
القوات المسلحة في الهند ضد المسلمين في الهند .
بهمالانا العامة للرابطة ان تحيطكم علما بان هذه القضية من القضايا
الاسلامية التي تعتنى بها الرابطة وقد اوصى المجلس التأسيسي للرابطة في
دورته الاخيرة قادة مختلف الدول الاسلامية بكل القوة الممكنة بان ينتهوا
لمخطط الهند وان يتخذوا من الاجراءات العنيفة على المستوى الدبلوماسي
والسياسي والاقتصادي ما يجبر حكومة الهند على ايقاف مخططاتها قبل ان تذهب
الى ابعاد ما ذهبت اليه وحتى لا تستفحل المعنة التي يتعرض لها اخواننا
المسلمين في الهند .
كما بعثت الامة العامة بمذكرة طالبت فيها الحكومة الهندية باحتسار
الحقوق الانسانية التي كفلها دستور الامم المتحدة وضادق عليها وتضمنها
دستور الهند .

شاكرين لكم اهتمامكم والمولى الكريم نسأله ان يعلى كلمته وينصر عباد
انه نعم المولى ونعم النصير .

والله يحفظكم

الامين العام
محمد علي الحركان

٤/٤

٢/٩

19 دسمبر 1982ء کو ہم نے بیک وقت یورپ کے پانچ دارالحکومتوں میں مظاہرے کئے

National Freedom - Our Birthright JAMMU KASHMIR LIBERATION FRONT



جموں کشمیر لبریشن فرنٹ

HEAD OFFICE
438 Alum Rock Road,
Birmingham 8, U.K.
Tel: 021-328 2647

Date... 19-12-1982

KASHMIRIS' PROTEST DEMONSTRATIONS IN
LONDON, PARIS, WEST BERLIN, THE HAGUE AND COPENHAGEN.

Hundreds of Kashmiris today marched through the streets of London, ^{West Berlin,} Paris, the Hague and Copenhagen shouting 'Foreign Occupants Quit Our Kashmir', 'No, No, No to Permanent Division of Kashmir', 'Voice of Kashmir Free Kashmir' and 'Independence the Only Solution of Kashmir'. They also delivered protest notes at Indian and Pakistani embassies and consulates in these cities. These letters called the reported ventures by Indian and Pakistani governments to solve the 35 year old Kashmir issue by dividing Kashmir permanently between themselves as heinous, nasty and brute. The letters said that the only just, equitable and honourable solution of the issue was to re-unify the divided Jammu Kashmir and let it emerge as an independent state.

These demonstrations were arranged by Jammu Kashmir Liberation Front four days before the foreign secretaries of India and Pakistan are to meet in New Delhi to discuss ways and means to bring about amity between the two countries. Kashmiri people apprehend that there will be a deal on Kashmir.

In London about 400 Kashmiris assembled at Hyde Park where a rally was addressed by Front leaders including Mr Asghullah Khan, its President. Mr Khan said that the governments of India and Pakistan had no right to decide the future of 9 million Kashmiris against their will and added that Kashmiris future was not subject to the whims and vagaries of the people at the helm of affairs in New Delhi and Islamabad. Demanding re-unification and complete independence of the whole state of Jammu Kashmir Mr Khan said, 'Both India and Pakistan stand committed to it nationally and internationally. We will not allow our inherent, inalienable, pledged and internationally recognised right of self-determination to be sacrificed at the altar of Indo-Pakistan amity. In number we are more than the individual populations of about one hundred free and independent nations of the world and we can manage our own affairs in a far better way than India and Pakistan do.'

Zafar Khan
(Zafar Khan)

Deputy Secretary General

ان تمام اقتصادی قسمنے ضروریات کا حاصل یہاں ہو رہا ہے جس کی مکمل خود مختاری ہے۔

[illegible]

نیز ان ملک اکثر آپ کو واقعی کشمیر کہہ کر لے گئے تھے۔ اگر آپ مسئلہ کشمیر کا مفصل حل چاہتے ہیں
 اگر آپ معاہدہ پاکستان کے بارے میں درجہ ذیل تفصیلات پسند کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ قومی و ملکی اور غیر ملکی
 قرضوں اور اندراج کو باطل و جھوٹی شہادت کی بجائے عظیم کی خوشگامی پر صرف غور و دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ بھارت
 کو بین الاقوامی سطح پر مستور و سرکشی سے پرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر کرکٹ و قومی
 و عسکری کاموں کا شوق ہے۔ اگر آپ دنیاوی انسانی حقوق میں یقین رکھتے ہیں اور اگر آپ خیر و انصاف کی بالادستی
 کی علمبردار کے دعویٰ میں کچھ ہیں تو آپ مسجد پر فرض عاید بنو قیام کہ آپ مسئلہ کشمیر کو ہادی راسخ قرین کہہ
 (جن میں پاکستان کے تحت رہا تھا علیحدہ قلمبند شامل ہیں) کی مکمل خود مختاری کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش
 کریں اور اس کو نقشہ کشی و اعتباری سرنگار انداز سے دیو۔

یہ کہتا ہے کہ اگر کسی نے اپنے دل سے کسی اور کو محبت کی بات کہی تو اس کی محبت اس کے دل سے نکلتی ہے اور اس کی محبت اس کے دل سے نکلتی ہے اور اس کی محبت اس کے دل سے نکلتی ہے۔

حضرت حفصہ! دورِ حاضر کے پیش نظر مجھے کسی عمر انسان اس وقت کا موازنہ آسانی سے لگ سکتا ہے کہ
مستقبل نوآبادیاتی اور استعماری نظام کے خنداں کا یہیں ہلکے ان خنداں پر غور کرنے والی قومی آزادی کی تحریکوں
کا ہے۔ جیسے اس کے سبب حضرت اس قبیل حقیقت کی روشنی میں میرا گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے

(امان الدفان)
صدر مجبور کشتہ لبریشن فریڈ

کشمیر بلوچستان مغربی صوبہ دوسری ادراختی فیصلہ جناب امان اللہ خان کا خط

اب جناب امان اللہ خان کے خط کا متن ملاحظہ فرمائیے
لندن ۸۳-۱-۲۳

جناب ارشد اور حلقہ صاحب
السلام علیکم۔ امید ہے آپ خیریت سے
ہوں گے۔ "جنگ" لندن میں آپ کے قرائن
سلیبہ جامع اور انتہائی مری سوجہ پر مبنی مضامین پر
مطالعے کا کام حصہ ہے۔ اللہ کرے زور ہم اور زیادہ۔
ہماری تنظیم کی سرگرمیوں کی مختصر رپورٹ اور اپنے کتابچہ
"نظر یہ خود فکر" شریعت کی ایک ایک کاپی بھیج رہا ہوں۔
کچھ وقت نکال کر پیکر رپورٹ پڑھیں پھر کتابچہ۔
اگرچہ کتابچہ کا عنوان ہی ہمارے اکثر پاکستانی بھائیوں کی
طرف سے انتہائی جارحانہ ہے مگر اللہ کی رحمت و
ہمہ آہی کے ساتھ پاکستان کے سلیبہ صحابہ اور مشہور
کافر ہیں۔ یہ کہہ اس قسم کے اہم موضوعات پر
تعمق فرمائیے۔ یہ موضوع اس لئے اہم ہے کہ یہ اب تیزی
سے ریاست کے دونوں حصوں کے لوگوں کے پاس
ایران کا حصہ بننا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں ہم بائیں
بائیں پوری ریاست کا پاکستان سے الحاق اب محال
ہیں۔ یہ اور اس صورت حال کی ذمہ داری ہماری
استقامت کے علاوہ پاکستان کی سرگرمیوں کی اپنی
ہمہ آہی کا کام ہوتی ہے۔ کوالی پاکستان کے لئے اس
حقیقت کو تسلیم کرنا خاصا مشکل ہے لیکن اس حقیقت
کے خلاف کوئی دلیل یا ثبوت نظر نہیں آتا کہ کشمیر کے
بارے میں پاکستان کے سامنے اب صرف دو راستے ہیں
نمبر ۱ کہ آزاد کشمیر پر اپنے حق ملکیت کو قائم کرنے
لئے ہماری مشورہ کشمیر پیش کر کے بھارت کو بخش
دے یا بالفاظ دیگر مشورہ کشمیر کے پاس لاکھ
مسلحہاں سمیت سزا لاکھ آبادی کو بھارت کی ہادی غلامی
میں دے۔ نبر ۲ پوری ریاست کی مکمل خود مختاری کی
حمایت کرے جس کے لئے اسے آزاد کشمیر
کی قیمت ادا کرنی ہوگی لیکن ریاست کا وہ مقامی حصہ بھی
ہماری جگہ سے آزاد ہو جائے گا۔ ہمارا اندازہ ہے کہ
مسلحہ کشمیر بالآخر پوری ریاست کی مکمل خود مختاری کی
مستور میں ہی ملے گا۔ البتہ پاکستان خاص کر اہل
پاکستان کی حمایت و اعانہ کا ہم کو محرم مخالفت کے ذریعہ قائم
ہونے والا خود فکر کشمیر پاکستان سے گڑھے کے نتیجے میں
قائم ہونے والے سے بالکل مختلف اور پاکستان کے
منازعات کے حق میں ہو گا جب کہ خود مختار پاکستان
کے منازعات کے متعلق ہو گا۔

میرزا علی پور پٹواری کی سب سے اعلیٰ حد تک ہوں
جس نے اس طرف سے ہرگز کوئی سال ہماری مشورہ کشمیر

میں گزارے اور اس کے بعد پاکستان آیا۔ آج بھی میرا
سری سر پاکستان اور آزاد کشمیر سے کمر اور قریبی رابطہ
ہے۔ دونوں طرف کے مفادات کا ہماری سے معاملہ
کرنا ہوں اس کے برعکس آزاد کشمیر کی جو ان فعل کی
نظروں سے کشمیر میں بھارت کا گھڑا کر دار اور اصل ہے
اور انیس واں دور پر ہماری مقام کا کوئی تجربہ نہیں ہوا
چنانچہ پاکستان کی طرف سے ہونے والی پہلی یو ایڈی
میں ان کے لئے ناقابل برداشت ہوئی ہے کیونکہ جس
فصل نے جنم دیا وہاں ہمیں بھارت کا قصہ ہو اور اسے
اعراف کی طرف دیکھا جائے تو اسے اعراف میں جنم نظر
آئے گا۔ آزاد کشمیر کا پڑھا لکھا جوان جب مشورہ
کشمیر میں ہونے والے مسات احتجاج اور کشمیر میں
انہوں نے ہماری ذمہ داری کی بدترین گت کی حقیقت کی
روشنی میں اس حقیقت پر نظر ڈالے کہ گزشتہ ۳۷ سال
میں آزاد کشمیر میں صرف تین احتجاجات ہوئے اور تینوں
بار پاکستان کے حکمرانوں (سکاچ فورڈ کے مشعل میں
اپنے پاکستانی اقتدار) سے معمولی اختلاف کی عام آزاد
کشمیر کے متفقہ صدور کو ایما دیا ہری کرنے سے
پیشگی کان پڑ کر منظر آباد کے قہر مدارت سے باہر کر
دیا گیا اور آزاد کشمیر میں بحالی بوسر سے کہہ رہے ہیں
گزشتہ سات سال سے ہونے والے یہ زور عوامی
مطالبات مسلسل نظر انداز ہو رہے ہیں اس کے بدلے
پاکستان کی محبت کا کل ہوا کوئی غیر ملکی بات نہیں۔
چنانچہ میرے کتابچے کے سوال نمبر ۱۱ کا جواب جو ان
سئل کے لئے قابل قبول نہیں۔ خاص کر اب جبکہ
پاکستان اقوام متحدہ کی قراردادوں کا کریم ترک کر کے
مسلحہ کشمیر کو معاملہ شدہ کے تحت حل کرنے پر زور دے
رہا ہے (مصلحت شدہ کے تحت کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ
کرنے کا حق کشمیر کے اکلین یعنی کشمیری عوام کو نہیں
بلکہ بھارت اور پاکستان کے حکام کو حاصل ہے) اب
کے پاکستان کے ذریعہ نادر نے اقوام متحدہ کی جنرل
اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے مسلحہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی
قراردادوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ شاید وہاں موجود تھا
اور میرے پاس تقریر کا متن بھی ہے۔ ان حالات میں
مجھ جیسے لوگوں کے لئے جو ان سئل کو بھارت اور
پاکستان کے بائیں فرق وائن لین کر اسے میں ہی ہوتی
فحوس ہوئی ہے اور اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش
کرتے ہوئے مجھے ہر بار حسین شہید سہروردی مرحوم یاد
آتے ہیں۔ ایک بار مٹلی پاکستان کے ایک لیڈر کراچی
میں سہروردی مرحوم کی مہارت کو گئے۔ شیخ حبیب الرحمن
بھی سہروردی صاحب کے پاس تھے بلکہ ان کی پانی کرا
رہے تھے۔

خود فکر کشمیر پاکستان کے لئے ریاست کی موجودہ
پوزیشن کی نسبت (سیاسی، فوجی، اقتصادی اور سماجی لحاظ
سے) ہمیں زیادہ فائدہ مند ہو گا۔ برعکس پاکستان کے
ایک جمہوریت ممالک کی حیثیت سے غالباً آپ کا فرض
ہے کہ آپ اس موضوع پر اہل پاکستان کو دعوت کر
دیں۔ ضروری نہیں کہ آپ ہمارے طرز فکر سے اتفاق
کر لیں۔ اختلاف کی صورت میں آپ کے دلائل پر ہم
تسلیم کیے بغیر ذرا دل دینے پر جو کتابچے کے سطح پر
ہے تراش بیٹھتے ہوئے گا کیونکہ آپ کے بعض مضامین
جنگ لندن میں شائع نہیں ہوئے۔ (ایمان اللہ خان)

دوران حکمران سہروردی صاحب نے مٹلی پاکستان
لفظ سے کہا "میری طرف سے پاکستان کی سب سے
بڑی خدمت یہ ہے کہ میں نے اس جوان (شیخ حبیب)
طرف اشارہ کرتے ہوئے (کو لائے دار حکم لاکر تاج
میں رکھا ہے۔ اگر میں جلدی کر گیا اور آپ لوگوں نے
اس کے جائز مطالبات رد کر لئے تو اندازہ کرنے اور
انہیں اس کی پاکستان دشمنی سے تعبیر کرنے کا سلسلہ
جاری رکھا تو شاید پاکستان موجودہ شکل میں "مہذب رو
کے" اس کے بعد احتجاجات کے ذریعہ مشرقی پاکستان
کے غیر متاثرہ لیڈر ثابت ہونے اور ہمارے پاکستان کے
اکثریت ووٹ حاصل کرنے والے کو اس کے اور پاکستان
کی لیسہ آبادی پر مشتمل اس کے چوکوں کو ان
کے مازحق سے محروم کر دیا تو نتیجہ اس سے بھی کہیں
زیادہ گھمبیر تھا جس کی سہروردی مرحوم نے پیشنگوئی
کی تھی یعنی اسلام کے نام پر بننے والی ملکیت کے
باجے پر نامی اسلام کی سب سے بڑی گت کا سیاہ
دھبہ۔ سہروردی مرحوم تو شاید صرف کشمیر کی طرف
اشارہ کر رہے تھے خود کہ کشمیر بھی ایسی کٹی مثل
پڑیں گے۔

جیسا کہ جناب امان اللہ خان کو خود اندازہ ہے
پاکستان میں بہت سے لوگ ان کے مشورہ نظر سے اختلاف
کر رہے ہیں اس سے آگاہ رہا ہمارے لئے ضروری
ہے۔ کئی صاحب اگر اس موضوع پر کہہ سکیں تو
ان کے خیالات "جنگ" کے صفحات میں شائع ہو سکتے

ہماری طرف سے ہر سال سفیروں کو بھیجے جانے والے سال نو مبارک کارڈوں میں سے ایک

Wishing Your Excellency and the people of Your Excellency's country a happy, peaceful and prosperous

NEW YEAR

8 million people of Jammu Kashmir State, more in number than the individual populations of as many as 92 independent nations of the world, who remain denied of their inherent, inalienable, pledged and internationally recognised right of self-determination and whose beautiful homeland remains forcibly divided, defaced and trampled,

RE M I N D

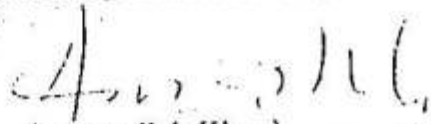
Your Excellency and Your Excellency's Government who are signatories to UN Charter and UN General Assembly Resolutions 1514 and 2621 (Declaration on Decolonization and its Implementation), of their

MORAL RESPONSIBILITY

towards Kashmiri people's fully deserved right to self-determination.

For JAMMU KASHMIR LIBERATION FRONT

438 Alum Rock Road,
Birmingham B8 3HT
United Kingdom.
tel: 021 328 2647


(Amanullah Khan)
Secretary General

اینٹی انٹرنیشنل کی طرف سے ملنے والے خطوط میں سے دو

URGENT amnesty international URGENT ACTION

International Secretariat, 10 Southampton Street, London WC2E 7HF, England

Amnesty International opposes by all appropriate means the imposition and infliction of death penalties and torture or other cruel, inhuman or degrading treatment or punishment of prisoners or other detained persons whether or not they have used or advocated violence. Index: ASA 20/02/81 Distr: UA (Amnesty International Statute, Article 1(c))

FOR ACTION ONLY BY THE FOLLOWING NATIONAL SECTIONS: AUSTRALIA, JAPAN, NETHERLANDS, NEW ZEALAND, SWEDEN, USA

UA 194/81

Death Penalty

12 August 1981

INDIA: Maqbool Ahmed BUTT

Maqbool Ahmed Butt, a journalist and former President of the Jammu and Kashmir National Liberation Front, was convicted of the murder of an Indian intelligence officer in 1968. He was sentenced to death in 1976, under the provisions of Section 3 of the 1948 Enemy Agents Ordinance, which do not allow for appeal as provided under ordinary criminal law. It is believed that his petition to the President for clemency has been turned down. He is detained in Tihar Jail, Delhi, and has recently been transferred to the "death cell".

The Himalayan state of Jammu and Kashmir has been a politically sensitive area since 1947 when the partition of the Indian sub-continent split the state of Jammu and Kashmir between India and Pakistan. Many Kashmiris in both India and Pakistan have been demanding the right to self-determination, and the Jammu and Kashmir National Liberation Front is one of the organizations which has been asserting this right.

During the past 30 years there have been several legislative moves to abolish the death penalty in India. More recently on 9 October 1979 the Supreme Court stayed the executions of more than 100 people under sentence of death for a period of seven months while the constitutionality of the death penalty was considered. On 9 May 1980 the Supreme Court ruled that the death penalty was constitutional but that it should be inflicted only in the "rarest of rare circumstances". Since this ruling, Amnesty International has learned of one execution and is concerned about the fate of several others who have exhausted all possibilities for appeals for clemency. Both the President and the governor of a State have the power to grant clemency.

Amnesty International is opposed to the death penalty in all cases without reservation on the grounds that it is a violation of the right to life and the right not to be subjected to cruel, inhuman or degrading punishment.

RECOMMENDED ACTION: FOR ACTION ONLY BY THE FOLLOWING NATIONAL SECTIONS: AUSTRALIA, JAPAN, NETHERLANDS, NEW ZEALAND, SWEDEN, USA

A limited number of appeals is requested; please organize up to 10 appeals only.

Telegrams/airmail letters respectfully urging the President to commute on humanitarian grounds the death sentence passed on Maqbool Ahmed Butt.

.../...

جہد مسلسل

376



**amnesty
international**

INTERNATIONAL SECRETARIAT
1 Easton Street London WC1X 8DJ
United Kingdom

Our reference: ASA/YT/ET

Direct line:

Mr Amanullah Khan
Jammu Kashmir Liberation Front
438 Alum Rock Road
Birmingham 8

5 October 1983

Dear Mr Khan

We have now written to the Chief Minister of Jammu and Kashmir about the arrests of party workers in the State in August/September.

Kindly keep us informed of any further details of names of arrested persons, or of releases of the seven men whose names were given. I would also appreciate receiving precise details of the "mental and physical torture" to which you state those arrested are subjected. For that purpose, I enclose a data questionnaire which lists the sort of details we would like to have.

Looking forward to hearing from you,

Yours sincerely

Yvonne Terlingen
Yvonne Terlingen
Asia Research Department

Enc.

☎ 01-833 1771 Telegrams: Amnesty London WC1 Telex: 28502

Amnesty International is an independent worldwide movement working impartially for the release of all prisoners of conscience, fair and prompt trials for political prisoners and an end to torture and executions. It is funded by donations from its members and supporters throughout the world. It has formal relations with the United Nations, Unesco, the Council of Europe, the Organization of African Unity and the Organization of American States.

میری ملک بدری کے بارے میں برطانوی وزیر داخلہ کا حکمنامہ جس پر اس نے عدالتی فیصلے سے پہلے ہی دستخط کئے تھے

IMMIGRATION ACT 1971

AUTHORITY FOR DETENTION

Whereas I have decided to make a deportation order under section 5(1) of the Immigration Act 1971 against

AMANULLAH KHAN

a Pakistani national and he is neither detained in pursuance of the sentence or order of any court nor for the time being released on bail by any court having power so to release him:

I hereby, in pursuance of paragraph 2(2) of Schedule 3 to that Act, authorise any constable at any time after notice of the decision has been given to the said

AMANULLAH KHAN

in accordance with the Immigration Appeals (Notices) Regulations 1972, to cause him to be detained until the deportation order is made.

Doyle And

One of Her Majesty's Principal
Secretaries of State

19th September 1986. 11.23 pm

Home Office

Queen Anne's Gate

برطانوی وزارت داخلہ کی طرف سے میری برطانیہ بدری کی وجوہات کی وضاحت



HOME OFFICE

Lunar House Wellesley Road Croydon CR9 2BY

Telephone (Immigration) 01-686 6611 / Calls answered in turn
(Nationality) 01-686 3441 / please wait for a reply

Served on 19/9/66

Mr. Amamullah Khan

Please reply to The Under Secretary of State
Your reference

Our reference

Date 19/9/66

Sir,

In view of your activities whilst resident in the United Kingdom, which the Secretary of State has reason to believe have been carried out on behalf of the Jammu Kashmir Liberation Front, the Secretary of State has decided that your presence in the United Kingdom is not conducive to the public good for reasons of national security. Accordingly, he has decided to make a deportation order against you by virtue of Section 3(5)(b) of the Immigration Act 1971 requiring you to leave the United Kingdom and prohibiting you from returning while the order remains in force.

By virtue of S15(3) of the Act, you are not entitled to appeal against the decision to make the deportation order but, if you wish, you may make representations to an independent advisory panel. You will be allowed to appear before the panel if you wish to do so but may not be represented. To such an extent as the advisers may sanction, you may be assisted by a friend and arrange for third parties to testify on your behalf. You should inform the officer who hands this letter to you whether or not you wish to make representations to the panel of advisers.

If the Secretary of State makes the deportation order you will, by virtue of Section 17(1) of the Act, have a right of appeal against removal to the country specified in the removal directions on the grounds that you ought to be removed to a different country specified by you.

Yours faithfully

A. Underhill

برطانیہ کے وزیر داخلہ ڈگلس ہرڈ کے شیڈو وزیر داخلہ جیرالڈ کاٹمین کے نام میری برطانیہ بدری سے متعلق خط کا متعلقہ حصہ



QUEEN ANNE'S GATE LONDON SW7H 9AT

15 October 1986

Dear General,

Thank you for your letter of 24 September enclosing this correspondence about Mr Amanullah Khan. Your representations cover a number of different issues which I shall deal with separately, but it may be helpful if I first of all set out the background to this case.

IMMIGRATION HISTORY

Mr Khan was born in Gilgit on 24 August 1934 and is a citizen of Pakistan. He was originally admitted to the United Kingdom on 20 June 1976 from Pakistan for a visit of four months. During that time he sought a work permit to enable him to take employment as the editor of the "Voice of Kashmir International". This publication was financed and organised by members of the Jammu Kashmir Plebiscite Front, which became the Jammu Kashmir Liberation Front (JKLF) in 1977. Mr Khan had been sent to the United Kingdom to organise the United Kingdom branch of JKLF. After initially refusing the application, the Department of Employment granted a permit in January 1978 and his wife and child were granted entry clearance to join him in August 1978. Further extensions of stay were given until 6 April 1982 when indefinite leave to remain was granted.

Mr Khan applied for naturalisation in September 1982. When interviewed he said that he was full-time President of JKLF and that he wanted to obtain British citizenship to enable him to travel more freely. The application was refused on 15 February 1985.

On 5 September 1985 Mr Khan was arrested and charged with:-

- (1) Possessing explosive substances with intent to endanger life; and
- (2) Possessing explosive substances under suspicious circumstances.

Mr Khan was remanded in custody and on 17 July 1986 appeared at St Albans Crown Court. The trial was concluded on 23 July 1986 when the jury returned a verdict of "Not Guilty" on count (1), and were unable to reach a majority verdict on count (2). A re-trial was ordered and Mr Khan was remanded in custody to appear at St Albans Crown Court on 15 September 1986. The second trial was concluded on 19 September, when a verdict of "Not Guilty" was returned.

At the conclusion of the criminal proceedings, on my instructions Mr Khan was served with a notice of intention to deport on grounds of national security under Section 3(5)(b) of the Immigration Act 1971 and he was served with a detention order under paragraph 2(2) of Schedule 3 to the Immigration Act 1971. An application for an order of habeas corpus was dismissed in the High Court on 3 October. Mr Khan is detained in Brixton prison pending the outcome of his representations to an independent advisory panel.

The Rt Hon Gerald Kaufman, M.P.

/over.....

2.

DECISION TO MAKE A DEPORTATION ORDERS

The "Voice of Kashmir" published an article in 1976 in an edition edited by Mr Khan giving the origins of JKLF. It said that in 1965 Mr Khan agreed with others to form the Jammu Kashmir National Liberation Front to establish a guerilla movement to liberate Kashmir. Mr Khan was appointed head of the group's political wing. The group was to recruit, train and equip guerillas for operations against India. The political wing was to educate public opinion in favour of the armed struggle. The organisation's aim was to strive to acquire by all possible ways, including armed struggle, a position for the people of Jammu Kashmir in which they were able to determine their future as sole masters of their homeland.

The JKLF, by their own admission, were involved in a number of illegal activities in India in the period 1966-1977 leading to the deaths of at least two people. An Indian aircraft was hijacked by supporters of the group in 1971. In 1984 members of the group kidnapped and murdered the Indian Assistant Commissioner in Birmingham.

Given that Mr Khan was a founder and leading member of an organisation advocating and using violence against the Government of India and in the light of other information of a confidential nature put before me, I decided that Mr Khan's presence in the United Kingdom was not conducive to the public good for reasons of national security. I accordingly decided that Mr Khan should be served with a notice of intention to deport on grounds of national security under Section 3(5)(b) of the Immigration Act 1971 and detained if he were acquitted of the current charges against him or given a non-custodial sentence. I must stress that this decision was taken on evidence which was not relied upon by the Crown Court at St Albans. As is usual where issues of national security are concerned details are not made public for obvious reasons, and by virtue of Section 15(3) of the Immigration Act 1971 Mr Khan is not entitled to appeal against the decision to make a deportation order against him. He has been informed, however, that he may make representations to an independent advisory panel; that he may appear before the panel and to such extent as the advisers may sanction, may be assisted by a friend (but not a legal representative) and arrange for a third party to testify on his behalf.

Concurrence,

Dy. Secy.

میری برطانیہ بدری کے بارے میں گارڈین لندن اور الجیمہ کویت کے ادارے

Hurd's bloomer over Mr Khan

Exactly ten years ago, a Labour Home Secretary, Mr Merlyn Rees, deported Messrs Agee and Hosenball on national security grounds. The decisions raised a memorable protest and Mr Rees confessed that it had been a politically traumatic affair for him. Since then, this rare power has not been invoked. Until now. Ten years on, Mr Douglas Hurd is invoking national security to allow him to get rid of Mr Ammanullah Khan, a Kashmiri nationalist. The evidence suggests that he is prepared to ignore a string of principles of justice to do so.

Mr Khan is an elderly man, who has spent most of the last few years travelling the world to put the case for Kashmiri self-determination. Once upon a time Britain was not unsympathetic to that cause — but no longer. For ten years, along with many thousands of Kashmiris, Mr Khan has lived in this country. The young members of his family know no other home. Inevitably, he is active here in political causes which bring distress and outrage to the governments of Pakistan and, in particular, India. Earlier this year, Mr Khan was acquitted unanimously at St Albans Crown Court on explosives charges. Immediately afterwards he was rearrested by police officers who filled in details on a blank cheque deportation order which already bore Mr Hurd's signature. He is currently in Brixton prison, where he has been for 15 months. He is suffering from lung cancer and a hernia.

On the face of it, therefore, Mr Khan doesn't sound like, say, a Hindawi or a Patrick Magee. But the Home Secretary says his presence in this country is not conducive to the public good on grounds of national security. And, as happens in such cases, this assertion immediately stacks all the cards in Mr Hurd's hands. This month, Mr Khan presented his case to the three advisers who are appointed to consider his representations. It was a procedural farce, just as it was with Agee and Hosenball. No lawyers allowed. No cross examination of witnesses. The Home Office even reneged on a commitment not to reintroduce evidence that had been discredited in the Crown Court trial. A few days ago predictably, Mr Hurd upheld his own original decision.

The power to deport on national security grounds is a lawless power. On the rare but celebrated occasions when it has been invoked (Rudi Dutschke, Franco Caprino, Agee and Hosenball), the decisions have been deeply suspect, not to say downright wrong. Just such a suspicion hangs over the Khan case today. But at least those earlier cases roused parts of the public conscience. There were parliamentary debates. There was public protest. Where are those voices now that Mr Khan needs them? Unless they are raised — and raised fast — Mr Hurd is going to get away with his dubious and unscrutinised expulsion.

THE GUARDIAN 1-12-1986

■ برطانیہ تبعہ امان
اللہ خان



علی الرغم من ان الحكومة البريطانية الكبرى برأت السيد امان الله خان رئيس جبهة تحرير جامو وكشمير من كل التهم النسوبة اليه وفي مقدمتها تهمة محاولة امان الله خان قتل راجيف غاندي رئيس وزراء الهند أثناء زيارته لبريطانيا في اكتوبر ١٩٨٥ وعلى الرغم من التندبات والاحتجاجات الصادرة عن الكشميريين والباكستانيين والمهتات الاسلامية داخل بريطانيا وخارجها الا ان الحكومة البريطانية اصررت على ابعاده يوم ١١ ديسمبر الماضي واعطت زوجته وابنة مهلة ثلاثة اشهر اخرى لمغادرة بريطانيا. اكثر المراقبين والمحللين السياسيين يربطون بين قرار الابعاد وبين صفقة الاسلحة المقودة بين الحكومتين البريطانية والهندية والتي اصررت الهند قبل توقيعها على ابعاد امان الله خان من بريطانيا وهذا يؤكد حجم المؤامرة ضده وزيف كل التهم النسوبة اليه.

ان المطلوب اليوم من كافة الحكومات والمهتات والوسات الاسلامية مساندة الشعب الكشيري السلم في كفاحه العادل من اجل التخلع من ربققة الاحتلال الهندي البغيض الذي يحاول تعريض ثورة الشعب الكشميري بشنى الوسائل والمؤامرات والمكائد.

برطانیہ میں میری اسیری کے دوران اخبارات کی سرخیوں میں سے کچھ

New fears for
the safety of
JKLF leader

HIGH COURT BID TO FREE LEADER FAILS

Kashmiri group
in pledge to
step up battle

LAST-DITCH BID TO STOP DEPORTATION

THE CITIZEN, Thursday, October 2, 1986

KLF man cleared of chemical charge

Judge refuses to free cleared Kashmiri

Hurd 'signed blank expulsion order'

New fears for
the safety of
JKLF leader

Cleared Kashmir
dissident to
fight expulsion

ایڈیٹریل شخصیات کو برطانیہ کی حکومت نے ان کے ملک کی آزادی کی خاطر طلب کر لیا



برطانیہ کے رائل جارجز ہسپتال میں محشر یون کے نمبر

امان اللہ خاں سمیت ریش فرنگ کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا

THE DAILY JANG LONDON, FRIDAY, OCTOBER 10, 1986.

امان اللہ خاں کی گرفتاری کے بعد کو باؤس کا سینٹر میں اٹھانے کی ہمت

امان اللہ خاں کو بری ہونے کے فوراً بعد دوبارہ گرفتار کر لیا گیا

پوری نے کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ امان اللہ خاں کی گرفتاری کے بعد دوبارہ گرفتار کیا جائے یا نہیں۔ یہ تمام افسانوں کی طرف سے ہے

امان اللہ خاں - ضمیر کے قیدی

انہیں سیاسی نظریات کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔ انہیں کوئی دہشت گردی نہیں ہے

ہرم آفس نے امان اللہ خاں کو ملک کی حکومت کے اگاہ کر دیا

امان اللہ خاں برطانیہ پہنچے اور ان کے ساتھ ایک سیاسی پناہ کی درخواستیں بھیج دی گئیں

امان اللہ خاں کی جین بچائی کی ضرورت کی بہت آڈیو ٹیپیں بنی گئیں

امان اللہ خاں کی گرفتاری اور ملک کی حکومت کی اس بات میں حیرت مچا گیا

امان اللہ خاں کے بارے میں مشرقی نیل کی پورٹل میں سیرٹری کو پیش کر دی گئی

وہیں آؤں کشتیر

کے کچھ اداروں اور مضامین کی سرخیاں

کشمیری نوجوانوں سے

تری بربادوں کے شوقے ہیں آسمانوں میں

تن ہمہ داغ داغ شدہ پنبہ کجا کجا نہم

توے فروختند پر ارزاں فروختند

کشمیریوں کی قومی غیرت کہاں گئی

پاکستان کا المیہ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے شہدائے کشمیر کی خدمت میں

PEACE? NO! FREEDOM.

مرتضیٰ بھٹو! کشمیر تمہاری جاگیر نہیں

کشمیریوں کے من پر دوزخ دار قہر

کشمیریوں نے پر ایک زور دار قہر

دنیا کے تجارتی ادارے اور کشمیر

Imposture At Its Worst

پاکستان پائندہ باد

میں تنگی ہوں

موجودہ صورتحال اور کشمیریوں کے فرائض ملکاتِ بلتستان کے ساتھ یہ ظلم کیوں

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

